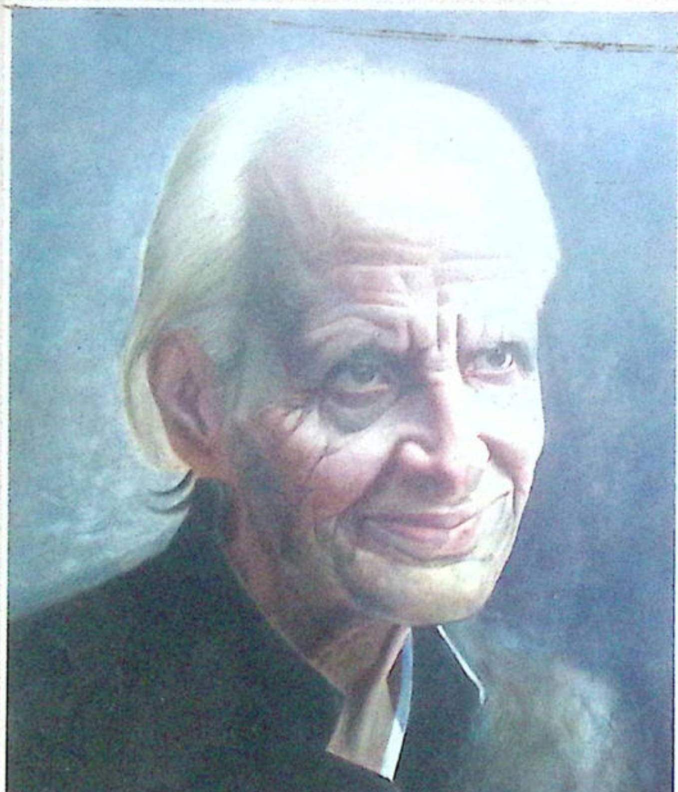
# کلیاتِ رئیس امروہوی



# کلیاتِ رئیس امروہوی

رئیس امروہوی

ناشر

ویلکم بُک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی

| | |
|---|---|
| اشاعت: | ۱۹۹۵ء |
| تعداد: | ۱۰۰۰ |
| ناشر: | ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ |
| سرورق: | سیف الاسلام کوٹی |
| کتابت: | طاہر اکرام |
| پرنٹر: | خالد پرنٹرز |
| قیمت: | روپے |

# انتساب

اپنی شریکِ حیات

سیّدہ بنتِ زینب

کے نام

رئیس امروہوی

# کبیکج

حشرات الارض کے مؤکل کا نام ہے۔
جھینگروں کا بادشاہ (اکثر کتابوں کے اوراق پر جہاں الشاں کرتے ہیں یہ لفظ لکھ دیا کرتے ہیں تاکہ کیڑوں سے محفوظ رہے چنانچہ پرانی کتابوں پر برابر یہ لفظ لکھا ہوا پایا جاتا ہے)

(فرہنگ آصفیہ)

زیرِ اہتمام
سیّد محمد قیصر زیدی (چیئرمین)
ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
مین اردو بازار کراچی
فون: ۲۱۸۰۱۶-۲۶۳۳۱۵۱ فیکس: ۲۶۳۸۰۸۶

# فہرست

## غزلیات

## رُومانیات

## منظومات

فلسفیانہ نظمیں:

## سیاسی نظمیں:

متفرق نظمیں:

**مزید نظمیں:**



## شخصیات و عید

## گوشۂ فارسی

# جُزوے از کُل

کلیاتِ رئیس امروہوی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ تم اپنے نثری مضامین و مقالات کو نظر انداز کر کے اتنے مجموعے نظم کے چھاپ چکے ہو آخر اس ضخیم کلیات کی طباعت و اشاعت پر اتنا وقت، اتنی ذہنی توانائی اور اتنا سرمایہ صرف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر کلیاتِ رئیس امروہوی کی اشاعت نہ ہوتی تو اردو کے ذخیرۂ شعر و ادب میں کون سی کمی رہ جاتی یا تمھارے ادبی موقف و مقام میں کون سی کسر واقع ہو جاتی۔ سوال برحق بھی ہے، برمحل بھی، مگر طاؤس خوش خرام اپنے رقصِ مسلسل کا کوئی جواز نہیں پیش کر سکتا اور بار بار یہ پھبتیاں سننے کے باوجود کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا، مسلسل گوشۂ صحرا میں رقص کناں رہتا ہے اسی طرح مجھے بھی کسی ناقابلِ مزاحمت اندرونی تقاضے کی بنا پر کلیاتِ رئیس امروہوی کی اشاعت پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ اندرونی تقاضے ہماری کمزوری بھی ہیں طاقت بھی! میر تقی میر کو خدائے سخن قرار پانے کے لیے سات دیوان مرتب کرنے کی ضرورت نہ تھی بہتر نشتر کافی تھے۔ سات دیوان مرتب کر کے میر صاحب نے کیا پایا؟ صرف یہ طعنہ کہ بلندش بسیار بلند و پستش بسیار پست! یعنی ان کے کلام کی بلندی بھی اتنی ہی حیرت انگیز ہے جتنی عبرت ناک ان کی فکرِ سخن کی پستی ہے یہی حال دوسرے بزرگانِ فن اور عزیزانِ سخن کا ہے۔

پھر اس پُرضخامت اور پُرجسامت مجموعے کو کلیات کہنا بھی مبالغہ آرائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دفتر کو جُزوے از کُل کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اپنے کلام کا بہت بڑا حصّہ میری دست رس سے باہر ہے۔ میں تقریباً ساٹھ سال سے شعر کہہ رہا ہوں۔ اب کسے یاد ہے کہ ان ساٹھ سال میں کیا کہا، کتنا کہا، اور کیوں کہا؛ چونکہ میرا روزگار قلم سے اور روزی کاغذ سے وابستہ ہے۔ اس لیے لکھنا اور کہنا میرا ذوق ہی نہیں آذوقہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ نثر و نظم کی ان تمام تحریروں کو جو امروہے، مراد آباد اور دہلی سے

کراچی تک منتشر ہیں فراہم کرنا ممکن نہیں تقسیم سے قبل میں نے جو مجموعۂ نظم و غزل مرتب کیا تھا۔ وہ میری نادانی اور کسی سخن شناس کی قدر دانی کے نتیجے میں گم ہو گیا۔ یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ آغازِ شباب کی کہانی کا یہ منظوم باب تلف اور ضائع ہو گیا۔ بہت سا کلام ایسا تھا اور ہے جسے میں نے محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ابتدائے شاعری میں فارسی زبان میں بھی اچھے خاصے شعر کہہ لیتا تھا۔ بعد کو اندازہ ہوا کہ یہ سودائے خام ہے۔ لہٰذا فارسی زبان کی بیاضِ سخن طاقِ نسیاں پر سجا کر رکھ دی۔ اس مجموعے میں الف لام پس غبار حکایت نے بملبوس بہار بحضرت یزداں، آثار اور نجم السحر کے انتخابات اور اقتباسات شامل ہیں۔ رہے قطعات کے مجموعے تو وہ دنیا ہی الگ ہے۔ ان قطعات کی دو ضخیم جلدیں ۱۹۷۰ء سے قبل شائع ہوئی تھیں۔ جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کے منتخب قطعات پر مشتمل تھیں۔ پھر گزشتہ سال ۱۹۵۹ء سے ۱۹۸۶ء تک کے قطعات چار جلدوں میں شائع کیے گئے۔ اس کے ساتھ قصائد اور مختصر مثنویوں کا مجموعہ ضمیر خامہ کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوا۔ کلیاتِ رئیس امروہوی میں غزلیات کے انتخاب کے علاوہ مختلف جذبات محسوسات اور رجحانات کے زیر اثر لکھی ہوئی نظمیں شامل ہیں۔ یہ نظمیں فکر و خیال، احساس اور جذبے کی مختلف سطحوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ فرمایش، ہنمایش، سفارش اور گزارش سے مجبور ہو کر مجھے ہر موضوع پر (نثر اور) نظم میں کچھ نہ کچھ کہنا اور کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ حمد، نعت، منقبت، مرثیے، سلام، بچوں کے لیے لوریاں، غنائیہ گیت، قومی ترانے، منظوم ڈرامے، تقریباتی نظمیں، قطعات، تاریخ وفات اور نہ جانے کیا کیا، ظاہر ہے کہ اس طومارِ لاطائل کو قلم زد بلکہ رد کرنا مناسب تھا۔ اب انشاء اللہ کوئی مجموعۂ نظم شائع کرنے کی تمنا نہیں ہے۔ البتہ یہ تمنا رہ گئی کہ مختلف موضوعات پر میں نے نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مجموعے شائع ہو سکتے۔ مگر اب وقت کہاں؟ اور فرصت کیسے؟

رئیس امروہوی

۱۰ر جولائی ۱۹۸۸ء

# ایک استیضاح

رئیس صاحب نے اپنی کلیات کے سلسلے میں ابتداءً جو اندازہ لگایا تھا اس کی کتابت اور کتابت کی تصحیح وہ خود کرا گئے تھے مگر انھوں نے اس مجموعے میں کچھ اور اضافہ کیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ ایک سو ایک کتابت شدہ صفحات کا اضافہ کیا جس کی کتابت کی تصحیح میں نے کی ہے۔ اس اضافی حصّے میں ان کا فارسی کلام بھی شامل ہے۔ اس تصیح کتابت کے دوران کلیات کا دیباچہ بھی جسکا عنوان ہے "جزوِ دے از کُل" نظر سے گزرا۔ ان معروضات تک پہنچنے سے پہلے آپ نے دیباچے کو پڑھ لیا ہو گا۔ جزوے از کُل کے مطالعے کے بعد مجھے یہ سطور لکھنے کی ضرورت کا احساس ہوا، ورنہ میں تصحیح کتابت پر قناعت کر کے مسودہ طباعت کے لیے دے دینے پر اکتفا کرتا۔ یہ احساس ان کے کس جملے سے ہُوا، اس کا اندازہ خود آپ کو بھی اس عبارت کے دو جملوں سے ہو گا۔ رئیس صاحب کے یہ چند بلکہ دو جملے ملاحظہ فرمائیے جو یہ ہیں، "یہ نظمیں، فکر، خیال، احساس اور جذبے کی مختلف سطحوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ فرمایش۔ فہمایش، سفارش اور گزارش سے مجبور ہو کر مجھے ہر موضوع پر نثر اور نظم میں کچھ نہ کچھ کہنا اور کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے، حمد، نعت، منقبت، مرثیے، سلام، بچّوں کے لیے لوریاں، غنائیہ گیت، قومی ترانے، منظوم ڈرامے، تقریباتی نظمیں، قطعات، تاریخ وفات اور نہ جانے کیا کیا؛ ظاہر ہے کہ اس طومار لاطائل، کو قلم زد بلکہ رد کرنا مناسب تھا۔ اب انشاء اللہ کوئی مجموعۂ نظم شائع کرنے کی تمنا نہیں ہے۔ البتہ یہ تمنا رہ گئی کہ مختلف موضوعات پر میں نے نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس کے مجموعے شائع ہو سکتے۔ مگر اب وقت کہاں؟ اور فرصت کسے؟"

ذرا اس خط کشیدہ جملوں "مگر اب وقت کہاں اور فرصت کسے؟" کو پڑھیے۔ ان دونوں جملوں کو پڑھ کر میں رک گیا اور سوچنے لگا کہ رئیس صاحب کی کس سوچ کی ریزش سے یہ جملے وارد ہوئے

ہیں۔ یعنی ظاہر ہے صورتحال یہ تو نہ تھی کہ مثلاً رئیس صاحب کو کینسر ہوا ہوا اور تمام ڈاکٹروں نے آخری بار یہ بتا دیا ہو کہ ان کی موت تین ماہ کے اندر واقع ہو جانی یقینی ہے یہ ہوا ہوتا تو البتہ ان جملوں کے لکھنے کا جواز پیدا ہوتا تھا یعنی پہلے جملے اور اسکے بعد کے جملے "یعنی" اور فرصت کسے ؟" کا جواز بھی سمجھ میں آتا تھا۔ رئیس صاحب کی رحلت (یا شہادت) ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کی شام ساڑھے چھ اور سات بجے کے درمیان واقع ہوئی اور انھوں نے یہ دیباچہ ۱۰ جولائی ۱۹۸۸ء کو مکمل کیا تھا۔ گویا اس عبارت لکھنے کے دو ماہ ۱۲ دن بعد ان کا انتقال ہوا۔ اب اگر صورت یہ ہوتی کہ ڈاکٹروں کی طرف سے ان کو تین ماہ کی کوئی مدت دے دی گئی ہوتی تو پھر ان دونوں جملوں کو لکھنے کا واضح جواز موجود ہوتا مگر ظاہر ہے کہ صورتِ حال یہ نہیں تھی۔ ان کی صورت حال یہ نہیں تھی۔ ان کی صحت بالکل نارمل تھی اور توقع کی جاتی تھی کہ وہ برسوں زندہ رہیں گے اور طویل عمر گزاریں گے اور معاملات کی نوعیت جب یہ ہو تو پھر ان کے مذکورہ جملے حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور قاری کو ان کا وہ مضمون یاد آتا ہے جس کی تحریر کے دوران اُن پر قاتلانہ حملہ ہوا اور خون کے قطرے کاغذ پر بکھر گئے۔

رئیس صاحب بار بار اپنی تحریروں میں روحیت کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اس روحیت کو اس صلاحیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو کائنات کے بُعدِ خامس (بُعدِ رابع کے بعد کی منزل) تک رسائی حاصل کرنے سے عبارت ہو سکتی ہے۔ یہ صلاحیت بہت کم آدمیوں میں ہوتی ہے اور پھر اس درجے اور قوت کی صلاحیت جیسی ان میں پائی جاتی تھی سو وہ تو خال خال افراد ہی میں پائی جاتی ہے یا پائی جا سکتی ہے۔ اُن کی زندگی میں یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ کائنات کے اسرار بداماں حصّے سے اتنا گہرا ارتباط رکھتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا حیرت انگیز پہلو ہے جو قلم وری کی تاریخ میں اُن کو ممتاز ترین افراد میں شامل کرنے کا سبب بن گیا ہے۔

سید محمد تقی

۲، فروری ۱۹۸۹ء

# عاجزانہ

میں کوئی مقدمہ یا مقالہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں تو اپنے عظیم الشان ٭ بھائی کی تخلیقی شخصیت کے بارے میں کچھ ایسی معلومات فراہم کرنا چاہتا ہوں جو میرے سوا کوئی اور فراہم نہیں کر سکتا۔

انھیں عظیم الشان کہنے کے بعد میں یہ کہنا نہیں بھول سکتا کہ وہ بلا کے کرتبی اور بہروپیا تھے کہ اپنی زندگی کے آخری ناٹک کے آخری منظر میں اپنے چہرے پر اپنا جیتا لہو مل کر اپنے عاشق ترین ناظرین کو ایسا محظوظ کر گئے کہ وہ بھی کیا یاد رکھیں گے!

---

(٭) میں نے بڑے بھائی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا، اس لیے کہ مجھے ان کی شاعری کے ساتھ ان کی شخصیت پر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا اور یہ بات میں اپنے خیال میں مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ان میں وہ عیوب کہیں زیادہ شدت سے پائے جاتے تھے جو اب تک غالب کی شخصیت کا اختصاص رہے ہیں۔ لیکن مجھ سے میری سب سے بڑی بھتیجی، میری دوست بھتیجی ریحانہ جمال کے شوہر سید حسنین مہدی نے کہا کہ بھائی مرحوم (وہ اپنے خسر کو ہم تینوں بھائیوں سید محمد تقی، سید محمد عباس اور میری طرح بھائی کہتے ہیں) کی کلیات میں آپ کے تاثرات کا شامل نہ ہونا بہت عجیب سمجھا جائے گا۔ یہی بات مجھ سے میری باقی بھتیجیوں یعنی دردانہ ہاشمی، شاہانہ رئیس، فرزانہ رئیس اور بھائی کی سب سے چھوٹی لڑکی خیزران اور بھائی کے دامادوں سبط اختر، جرار نقوی، حسنین رضوی اور سبط الطاہر نے بھی کہی۔

"آج ۲۱، ویں ماہ شوال ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۲ ویں ستمبر ۱۹۱۴ء بروز دوشنبہ. خدا نے مجھ کو فرزند عطا فرمایا، جس کا نام سید محمد مہدی عرف اچھن رکھا گیا۔"

(بابا علامہ سید شفیق حسن ایلیا کے روزنامچے سے)

وہ جس ماحول میں پیدا ہوئے اس میں علم، شعر گوئی، نثر نگاری اور تاریخ دانی کی روایت کئی پشتوں سے چلی آرہی تھی. جہاں تک شعر گوئی کا تعلق ہے تو ان کے بابا علامہ سید شفیق حسن ایلیا ان کے سنجھلے تائے سید وحید حسن رمز، منجھلے تائے سید انیس حسن ہلال اور بڑے تائے (دادا جی)، سید نفیس حسن نسیم چاروں کے چاروں شاعر تھے۔

ان کے دادا سید نصیر حسن نصیر بھی شاعر تھے وہ منوچہری دامغانی کے والہ وشیدا تھے اور اسی کی تقلید میں غزلیں کم اور مسمط زیادہ کہتے تھے ان کی تمام شاعری ان کے اجداد کے سرمایۂ فکر کی طرح غارت ہوگئی۔ مجھے ان کا ایک فارسی شعر اچانک یاد آگیا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے صحیح یاد نہ ہو۔

ے اے ساربان محمل لیلیٰ چہ پیش وپس
مجنون بجد راز گریباں تواں شناخت

نصیر امروہوی کے "میاں باوا جی" امیر الشعراء امیر امروہوی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ وہ صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ ان کا کچھ شعری اور نثری سرمایہ محفوظ رہ گیا ہے ان کی ضخیم تالیف "باران غم" "روضۃ الشہداء" سے مستفاد ہے ——— اس کتاب میں موقع ومحل کی مناسبت سے اشعار بھی آتے ہیں جو سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کچھ فارسی کلام "مطلع الشمسین" کے نام سے انھیں کے زمانے میں شائع ہوا تھا، جو محفوظ ہے۔ "مطلع الشمسین" کے علاوہ ان کا فارسی اور اردو کلام میرے پاس احتیاط سے رکھا ہوا ہے جس طرح میں لوح دبرد پر ہنوز "احتیاط" سے رکھا ہوا ہوں۔

رئیس امروہوی کے پر دادا حضرت امیر امروہوی کے جواں مرگ والد سید تصدق حسین شایاں نے ائمۂ اہلِ بیت کے معجزات کو "حدیقۃ الایمان" کے نام سے نظم کیا تھا۔ یہ تصنیف مثنوی کی ہیئت میں تخلیق کی گئی تھی۔

حضرت شایاں کے والد سید سلطان احمد سلطاں، میر تقی میر کے برگزیدہ ترین شاگرد سید عبدالرسول نثار سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق اپنی فنی تربیت کے دوران ملک الشعراء فیضی کے دیوان کو قلمی کیا تھا۔ ہمارے بزرگوں کے زمانے کا یہ خاص، دستور تھا کہ استاد اپنے ہونہار تلامذہ سے ملک الشعراء فیضی کا دیوان قلمی کراتے تھے۔

سید عبدالرسول نثار کو جو صرف شاعر اور شاگرد میر ہی نہیں تھے بلکہ صاحبِ سیف یعنی مُغل فوج کے ایک اعلیٰ افسر بھی تھے اور ایک مجرد آدمی تھے، ہمارے جدِ امجد سید ابدال محمد منصب دارِ عہدِ محمد شاہی دلّی سے اپنے ساتھ امروہے لے آئے تھے۔ وہ ہمارے ہی قدیمی دیوان خانے میں رہتے تھے۔ مصحفی ہفتے عشرے میں شرفِ خدمت بجالانے کے لیے ان کی محفل میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ مصحفی نے اپنے "تذکرۂ ہندی گویان" میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہمارے جدِ امجد سید ابدال محمد کی تعمیر کردہ مسجد کا قطعۂ تاریخِ تعمیر بھی سید عبدالرسول نثار ہی نے کہا تھا، جو مسجد کے درمیانی در کی محراب پر کندہ ہے اور وہ یہ ہے،

سید ابدال حامی اسلام — سالِ تاریخ از خرد گفتہ
مسجدے ساخت است عرش مماس — خانۂ کعبہ رانہادہ اساس

سید محمد مہدی کے مردان خانے (امیر منزل) میں صبح سے شام تک بحث وتمحیص کا ہنگامہ گرم رہتا تھا جس کے دوران بعض اوقات بحث کے فریقین کف در دہن ہو جایا کرتے تھے۔ نقصِ امن کی یہ کیفیت ہفتے میں دو ایک بار ضرور پیدا ہوتی تھی۔ محفلِ شام کے یہ ہندو، شیعہ اور سُنی سیاست اور سیاسی رہنماؤں کے تذکرے کو "فحاشی" سمجھتے تھے۔ اردو اور فارسی شاعری کے مختلف مکاتب،

اور مذہب خاص طور پر کائنات کا سب سے اہم مسئلہ یعنی مسئلہ خلافت و امامت اس پُر آشوب بحث و تمحیص کے پسندیدہ ترین موضوعات تھے۔ روزانہ کی یہ بحثیں سُن سُن کر اس مرحوم و مغفور (کاش میں یہاں خاکم بہ دہن کہہ سکتا) مردان خانے کے در و دیوار سُن ہو گئے ہوں گے۔

اس مردان خانے میں وقت کے حقیقی مسائل اور معاملات سے کبھی کوئی معمولی سروکار بھی نہیں رکھا گیا۔ وہ مردان خانہ تو صرف آفاقی مسائل کی پیش گاہ تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، حالات کے کیا تقاضے ہیں اور مستقبل کے بارے میں کس نہج پر سوچنا چاہیے؟ اس امر کو یکسر عامیانہ اور سوقیانہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا اور وقت و حالات کے شعور سے لاتعلقی کا یہ اندوہناک ترین مگر انتہائی دل انگیز اور ماجرا پرور عالم پوری کیفیت کے ساتھ اس محفل کے ذہنوں پر طاری رہا۔

شاعری اس ماحول میں لمحے لمحے کا ایک انتہائی اہم معاملہ تھی اور روزمرہ کے بیحد اہم خانگی امور کو بالکل ناقابلِ اعتناء، الم ناک حد تک ناقابلِ اعتناء گردانا جاتا تھا۔ باہر کے مختلف کاموں کو انجام دینے والے تائے شیخ رضی ہوں یا خصوصی دعوتوں کے منتظم تانے صفدر جو ہمارے پردادا سید امیر حسن امیر کے آزاد کردہ غلام تھے۔ "شعر سازی" سے گہرا سروکار اور شاعری کے بارے میں اپنا مخصوص معیار رکھتے تھے۔

ہمارے محلے کے ایک بزرگ چچا سید توقیر حسن، بابا کے ایک عزیز شاگرد و سید معراج النبی عروج تانے صفدر اور تائے رضی کے خاص ممدوح تھے۔ چنانچہ ان کی شان میں یہ حضرات ثلاثہ روزانہ ہی کچھ نہ کچھ اشعار پیش کیا کرتے تھے۔ انھوں نے چچا سید توقیر حسن کی مدح میں جو قصیدے کہے تھے ان میں سے میں نے یہ چند اشعار سنے ہیں۔

سیدِ توقیر حسن　　بلبل کیکر چمن
یار سے ایسی لگن　　اسکی قبا کے بٹن
مستِ الستِ سخن　　شاعرِ زاغ و زغن

چھٹے مصرع کے بعد فوراً ہی تائے رضی نے یہ مصرع لگا کر ایک مسبع بند مکمل کر دیا تھا۔

"آمدہ در شان او"

سب سے اہم بات یہ ہے کہ تائے رضی اور تائے صفدر کو فارسی شاعری کی ہندوستانی دنیا کے سب سے زیادہ "سنگلاخ" اور "مردم آزار" شاعر بدرِ چاچ کا نام معلوم تھا اور اس کے علاوہ یہ کہ انھیں دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" حفظ تھی۔

وہ بود و نبود کا ایک بہت متین اور مضحکہ خیز کھیل تھا جو نسل ہا نسل تک جاری رہا۔ میں سوچتا ہوں تو میرے سینے میں دھول اڑتی ہے، بگولے چکراتے ہیں اور نہ جانے کن اذیت رسیدہ روحوں کی پُراحتجاج آوازیں بڑبڑاتی ہیں۔ "وہ کون تھے، اور انھیں کیوں ہونا چاہیے تھا؟ اس کے بعد ایک بہت ہی نامانوس صدا سنائی دیتی ہے۔ "وہ تھے" مگر وہ نہیں تھے۔ وہ اس لیے نہیں تھے کہ وہ تھے۔

یہ تھا وہ گرد و پیش جس میں علامہ سید شفیق حسن ایلیا کے سب سے بڑے بیٹے سید محمد مہدی نے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ اس نے سب سے پہلے جس عالم، شاعر، ادیب، مورخ اور محقق کو دیکھا وہ اس کے "بابا" تھے جنھیں نہ اپنے تن بدن کا ہوش تھا اور نہ کھانے اور پہننے کا، موصوف صبح سے شام تک شعر فرمائی اور مختلف علمی موضوعات پر خامہ فرسائی میں محو رہتے تھے۔ آخر کیوں؟ اس سوال کا جواب مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ کوئی شبہ نہیں کہ وہ دنیا کے ایک بدبخت ترین شاعر اور مصنف تھے۔ وہ فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت اور عبرانی زبانوں کے عالم تھے۔ انھوں نے اردو، فارسی، ہندی اور انگریزی میں شاعری کی اور اردو کے علاوہ عربی میں بھی لکھا۔ ان کی ایک عربی کتاب "سوط العذاب" کتابت شدہ شکل میں میرے پاس محفوظ ہے جسے انشاء اللہ کبھی شائع نہیں ہونا۔ کاش میں انھیں قتل کر سکتا لیکن وہ مجھ سے کہیں زیادہ اذیت کوش اور سفاک تھے سو وہ مجھے پہلے ہی بسمل کر گئے۔

سید محمد مہدی نے نو دس برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ وہ اس وقت صبا عرفانی تخلص کرتے تھے۔ "عرفانی" اس لیے کہ ان کے گھریلو مکتب کے فارسی معلم سید اختر حسین کا تخلص

عرفاؔن تھا۔ سید محمد مہدی کا بیان ہے کہ ایک دن میں اپنے مردان خانے کی پچھلی گرہ میں اپنے پردادا (سید میر حسن) کی گول آبنوسی میز پر اپنی ایک غزل صاف کرکے اور صفحے کی پیشانی پر صباؔ عرفانی لکھ کر کسی کام سے زنان خانے میں چلا گیا، تھوڑی دیر بعد مردان خانے میں واپس آیا تو بابا نے مجھ سے پوچھا "اچھن! یہ صباؔ عرفانی کون صاحب ہیں؟

میں نے گردن کھجلاتے ہوئے کہا۔ "بابا! یہ میرا تخلص ہے"۔

بابا نے کہا: "لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی تخلص ہے!" اور پھر انھوں نے میرا تخلص "رئیسؔ" تجویز کیا، چنانچہ اس دن سے بارہ تیرہ برس کے حضرت صباؔ عرفانی، رئیسؔ امروہوی ہوگئے۔

اب میں ان کے بارے میں بہت زیادہ ذاتی اضافت کی فضا میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں ابّا جی (ہمارے سب سے بڑے تانے سید نفیس حسن وسیم جو لاولد تھے) اور میّا جی (جو ہماری سب سے بڑی تائی ہی نہیں سب سے بڑی خالہ بھی تھیں) نے بے حد ناز و نعم سے پالا تھا وہ بہت ہی نازک تھے، اگر انھیں چھینک بھی آجاتی تھی تو فوراً سید الحکما دادا حکیم سید محمد کو بلا لیا جاتا تھا۔ ان کا سالن خصوصی طور پر پکایا جاتا تھا۔ ان کا جی بہلانے کے لیے ایک بکری پالی گئی تھی جو کسی طرح بھی مہاتما گاندھی کی بکری سے کم نازپروردہ نہیں تھی۔ ان دونوں میں صرف ایک فرق تھا اور وہ یہ کہ مہاتما گاندھی چونکہ ایک عظیم الشان سیاسی شخصیت کے مالک تھے اس لیے وہ بکری بھی ایک سیاسی حیثیت رکھتی تھی اور رئیسؔ امروہوی ایک نازپروردہ نوخیز شاعر تھے اس لیے ان کی بکری ایک شعری اور ادبی دنیا کا چوپایہ تھی۔ موصوفہ بادام، پستے، ناشپاتی اور بہی کھاتی تھیں بھائی کو مجلس میں جو حصّہ (تبرک) ملتا تھا مثلاً نان ختائی، کھلواں، امرتی، موتی چور کے لڈو اور پیڑے، وہ اسے خود کھانے کے بجائے اپنی بکری کو کھلا دیا کرتے تھے، اپنا حصّہ ہی نہیں بلکہ چندن بھائی (کمال امروہوی) اور منجھلے بھائی سید محمد تقی کا حصّہ بھی ان سے لے کر بکری کی تواضع میں صرف کر دیتے تھے

جب میں بھائی کے بارے میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے متروک شہر رہائے وہ شہر ہا

کے حسین ترین نوجوان تھے تو مجھے اپنے دل میں یہ خلش محسوس ہوتی ہے کہ میں نے آدھا سچ بولا۔ اسی طرح جب میں یہ کہتا ہوں کہ وہ فطین ترین "ہستی" تھے تو میرے دل میں یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ نیں آدمی بات کہہ پایا ہوں۔ اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ وہ زود گو ترین اور قادرالکلام ترین شاعر اور معجز بیان ترین مصنف تھے تو مجھے اپنے عجز بیان کا ایک ہمت شکن احساس ہوتا ہے اور میرے اندر کوئی یہ کہتا ہے کہ تُو نے سچ کے آدھے حصے کو کاٹ پھینکا۔

وہ بلا کے شوخ و شنگ، شریر، ہنگامہ پرور، افواہ ساز، تیز و طرار، بے بند و بار "رضاکارانہ" دروغ گوئی کے ہنر میں طرفہ کارترین "شے" تھے۔ انھیں لوگوں کو چونکانے اور دنگ کرنے کا اتنا شوق تھا، اتنا شوق تھا کہ بس۔

وقت نے ان کے لیے لاکھوں انسانوں کو سناٹے میں مبتلا کر دینے والی جو سرخ موت تجویز کی، وہ ان کی ہنگامہ پسند طبیعت کے عین مطابق تھی۔

ان کی لالہ فام ماں سیدہ نرجس (فارسی میں نرگس) کو ان کے خسر سیّد نصیر حسن نصیرؔ فرنگن کہا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ۲۲ دیں ستمبر ۱۹۸۸ء کی شام کو جب قاتل کے پستول کی گولی اُس فرنگن ماں کے لالہ فام بیٹے کے خلاّق ترین دماغ کے آر پار ہوئی ہوگی تو "لہو لہان وہ" "لہو لہان وہ" گھر والوں کو حسبِ عادت چونکانے اور دنگ کرنے کے شوقِ بے حد میں اپنے گھرے سے دوڑ کر یہ خبر سنانے کے لیے بری طرح بے تاب ہوگا کہ

ے ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو، لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں

ان کا فنّی اور فکری وجود ابداعی عفریتیت اور اُلوہی عزازیلیت کا ایک ناقابلِ بیاں مظہر تھا۔ وہ شخص نہیں تھے بلکہ ایک حیران کن شے تھے۔ کسی نے کہا ہے، یا شاید کسی نے بھی نہ کہا ہو، میں نے ہی کہا ہو کہ تجربہ کوش فطرت بعض انسانوں کے وجود کی صورت گری کے ہنگام مبالغہ پسند ہو جاتی ہے۔ اس نے ان کے وجود کی صورت گری کے ہنگام کچھ اسی نوع کی واقعہ انگیز فعلیت کا مظاہرہ کیا تھا۔

بعض بہت سرسری اور یوں ہی سی باتیں کبھی کبھی افراد کی زندگی میں بے حد اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مثلاً اگر میر خلیق نے راستے سے گزرتے ہوئے ایک مُغنّیہ کی آواز میں اپنے بیٹے میر ببر علی کی غزل نہ سنی ہوتی اور گھر واپس جاکر اپنے بیٹے کو غزل گوئی سے روکا نہ ہوتا اور یہ نہ کہا ہوتا کہ ببر علی! غزلیں کہنا تمھارے شایانِ شان نہیں ہے تو شاید اردو شاعری کو مرثیہ گو خدائے سخن میر انیسؔ نصیب نہ ہوتا یا مثلاً اگر افلاطون نے ارسطو کے بجائے اپنے داماد کو اپنی اکیڈمی کا سربراہ نہ بنایا ہوتا تو شاید مشّائیت، اشراقیت (افلاطونیت) سے یکسر جداگانہ مکتبِ فکر کے طور پر وجود میں نہ آتی۔

اسی نوع کی ایک بہت سرسری اور یوں ہی سی ایک بات نے رئیسؔ امروہوی کی علمی اور تخلیقی زندگی میں شاید ایک بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس بہت سرسری اور یوں ہی سی بات کا انھیں وقوف نہیں تھا۔ اگر وقوف ہوتا تو مجھے اس خصوص میں گفتگو کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ ہمارے نفس کے وہی پیچاک (۱) سب سے زیادہ مؤثر ہوتے ہیں، جن کا ہمیں وقوف نہیں ہوتا۔ وہ بات، وہ سرسری اور یوں ہی سی ایک بات یہ ہے کہ ان کا نام سید محمد مہدی تھا۔ یہ نام ایک عامل تھا اور میرے خیال میں وہ اپنے اس نام کے معمول تھے۔ میں نے یہ بات کئی بار سُنی ہے کہ وہ اپنے لڑکپن میں تفنّنِ طبع کے طور پر اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ میں مہدی عصر ہوں۔ اس لیے کہ میرے والد کا نام سیّد شفیق حسن (۲) میری والدہ کا نام نرجس اور میرا نام محمد (محمد مہدی) ہے اور روایات میں یہی وارد ہوا ہے کہ امامؑ آخرالزماں کے والد کا نام حسنؑ (امام حسن عسکری) والدہ کا نام نرجس اور خود اُنکا نام محمدؐ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین تھے کہ بیسویں صدی میں سنجیدگی کے ساتھ اس قسم کی کوئی بات کہتے۔ وہ تو بہت سنجیدگی کے ساتھ سنجیدہ سے سنجیدہ بات پر قہقہہ لگانے کے خوگر تھے مگر آدمی کوئی بات سنجیدگی سے کہے یا مذاق میں، نفس، شدت اور ضعف کے فرق کے ساتھ دونوں کا

---

(۱) یہ بات گستاخانہ ہے مگر ہے کہ میں نے کمپلکس کا اردو ترجمہ 'پیچاک' بھائی کی خدمت میں پیش کیا تھا اور انھوں نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ اسے قبول فرمالیا تھا۔

(۲) ظاہر ہے کہ شفیق حسن' میں شفیق 'صفت' ہے، اور حسن اسم۔ ویسے بابا نے کئی جگہ اپنا نام حسن الشفیق بھی لکھا ہے۔ بہرحال۔

ارتسام قبول کرتا ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ نفس (ذہن) ہی فرد سے کوئی بات کہلواتا ہے اور پھر خود ہی اس بات سے اثر پذیر ہو جاتا ہے۔

ان کی اس یوں ہی سی بات نے ان کے نفس کے کسی عمیق ترین گوشے میں گھر کر لیا تھا۔ اور انکے ذہن میں اپنے دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے اظہار اور اثبات کا ایک بے حد طاقت ور رجحان پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

اسی سلسلۂ کلام میں بھائی کی ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ بھائی اتنے دروغ گو تھے کہ بس کیا بتاؤں۔ وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں یہ بات بہ تکرار کہا کرتے تھے کہ میں نے صرف مکتب تک تعلیم پائی ہے۔ یہ مکتب میرے دادا نصیر امروہوی نے ہم بھائیوں چندن (کمال امروہوی) نواب (سید ذی شان حیدر) چھبن (سید محمد تقی صدر) اور میرے لیے ہمارے مردان خانے میں قائم کیا تھا۔ اور دو معلم مولوی جعفر حسین اور سید اختر حسین عرفان ہماری اردو فارسی اور عربی تعلیم کے لیے مقرر کیے تھے جو ہمارے مردان خانے ہی میں رہتے تھے۔ میری تعلیم بس اسی مکتب تک ہوئی۔

یہ محض غلط بیانی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نفس کے اندر چھپا ہوا وہ کون سا محرک تھا جس نے ان کے اندر غلط بیانی کا یہ رجحان پیدا کیا۔ کیا وہ نادانستگی میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں ایک "مادر زاد عالم" یعنی اُمّی ہوں" اور یہ کہ میری تمام تر علمی، ادبی اور تخلیقی صلاحیتوں کا سرچشمہ "علم لدُنّی" ہے۔

حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ مردان خانے کے مکتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھیں، چندن بھائی (کمال امروہوی) اور منجھلے بھائی (سید محمد تقی صدر) کو امروہے کے عالی شان دارالعلوم سید المدارس میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان تینوں نے اسی دارالعلوم کے طالب علم کی حیثیت سے بورڈ کا پہلا فارسی امتحان دیا۔ اس امتحان کا نصاب یہ تھا (۱):۔

۱۔ تاریخِ زبان و ادبِ اردو۔

---

(۱) مجھ سے کتابوں کا نام بتانے میں بھول چوک ہو سکتی ہے۔

آبِ حیات، شعر الہند، گُلِ رعنا اور خطباتِ گارساں دتاسی

۲. نثرِ اردو اور قواعدِ اردو

باغ و بہار، یادگارِ غالب .... باقی کتابوں کے نام مجھے یاد نہیں۔

۳. نظمِ اردو

انتخابِ قصائدِ سودا، انتخابِ غزلیاتِ غالب، مثنوی سحر البیان اور مثنوی دیا شنکر نسیم

۴. ریاضیات

چکرورتی جبر و مقابلہ (الجبرا) اور تحریر اقلیدس (جیومیٹری)

۵. تاریخ اور جغرافیہ

جغرافیۂ عالم، تاریخ ایران از جان مالکم

۶. فارسی تاریخ ادب، نثر فارسی اور قواعدِ فارسی

صنادیدِ عجم از مہدی حسین ناصری، وقائع عالمگیری .... باقی نام یاد نہیں رہے۔

۷. نظمِ فارسی اور فصاحت و بلاغت

انتخابِ قصائدِ عرفی، انتخابِ غزلیاتِ نظیری، مثنوی سحرِ حلال از اہلی شیرازی، انتخابِ قصائدِ قاآنی، بیان و بدیع۔

اس کے بعد انھوں نے الہ آباد بورڈ کا فارسی کا سب سے اعلیٰ امتحان یعنی کامل کا امتحان دیا۔ یہ امتحان دو برس کا تھا۔ اس کے جواب فارسی میں دینا ہوتے تھے۔ اب میں اس کا نصاب پیش کرتا ہوں۔ لیکن اس باب میں مجھ سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔

۱. فارسی نثر

دفاتر ابوالفضل علامی؛ چہار مقالہ، سہ نثر ظہوری؛ ہمایوں نامۂ گل بدن بیگم، سرگزشتِ حاجی،

بابا اصفہانی اس زمانے کی جدید فارسی کا شہرۂ آفاق ناول)۔۔۔۔ وغیرہ

۲۔ فصاحت و بلاغت اور عروض

حدائق البلاغہ۔ معیار الاشعار از طوسی (۱)

۳۔ تاریخ زبان و ادبِ فارسی۔

تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی۔ شعر العجم (چاروں جلدیں)۔۔۔۔۔

۴۔ فارسی نظم۔۔۔۔

قصائدِ خاقانی۔ انتخاب شاہنامہ۔ غزلیات صائب اصفہانی۔ غزلیاتِ ابوطالب کلیم

دفتر اوّل از مثنوی مولانا روم۔ قصائدِ ظہیر فاریابی۔۔۔۔ وغیرہ

۵۔ تاریخ۔

اس پرچے کی کتابوں کے نام میرے علم میں نہیں۔

۶۔ منطق، فلسفہ اور فلسفۂ اخلاق۔

میزان المنطق۔ حیات النفوس اور اخلاقِ ناصری (۲)

۷۔ عربی قواعد اور ادب

اس پرچے کی کسی کتاب کا نام مجھے معلوم نہیں ہے۔

اس امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد بڑے بھائی نے اورینٹل کالج لاہور کا فارسی کا آخری امتحان یعنی فاضل کا امتحان بھی دیا۔ مجھے اس کے نصاب کی صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہیں یعنی سرگذشتِ وزیر خان لنکران اور فلسفۂ اخلاق کے موضوع پر محقق دوانی کی دقیق ترین کتاب "اخلاقِ جلالی"۔

---

(۱) یہ بات زیرِ بحث ہے کہ معیار الاشعار طوسی کی تالیف ہے یا کسی اور کی۔

(۲) اخلاقِ ناصری ابنِ مسکویہ کی کتاب الاخلاق کا فارسی ترجمہ ہے، اور اس میں نظریۂ ارتقاء پر بہت پُرمایہ گفتگو کی گئی ہے۔

لاہور کے اس قیام کے دوران بڑے بھائی اور ــــــــ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف بھی حاصل کیا۔ اس وقت علامہ اقبال بان کے کھرے پلنگ پر تکیہ لگائے ہوئے نیم دراز تھے اور حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ وہ نوخیز سید محمد مہدی رئیس اور ــــ سے بےحد شفقت کے ساتھ پیش آئے۔ انھوں نے مصحفی امروہوی کی تعریف کرنے کے بجائے امروہے کے آموں کی تعریف کی اور بہت کی۔ انھیں امروہے کا "چونسا" بہت پسند تھا۔

بڑے بھائی اپنی فارسی اور عربی تعلیم کے دوران نواب وقار الملک کے داماد صبغت اللہ صاحب سے جو انگریزی ادب کے جید عالم تھے، سہ پہر کے بعد انگریزی پڑھنے محلہ شاہی چبوترے جایا کرتے تھے۔ نواب وقار الملک کی اس گلی میں روز کی آمد و رفت کے دوران انھوں نے ایک قتالہ لڑکی کو اور اس قتالہ لڑکی نے انھیں وہ "آفت کا" نشہ پلایا جسے عشق بلاخیز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی لالہ فام نوجوانی نے اس وقت تک کئی ماجرا طلب لڑکیوں کو مار رکھا تھا، مگر اس بار وہ بھی کم زخمی نہیں ہوئے تھے۔ انھیں دنوں (۱۹۳۲ء) انھوں نے ایک غزل کہی تھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

معراجِ شوق نے یہ پہنچا دیا کہاں پر ۔ محسوس کر رہا ہوں قبضہ ہے دو جہاں پر

نواب درویش علی خاں کے پوتے عثمان بھائی مرحوم (عثمان علی خاں) کے بیان کے مطابق بھائی کی شادی کے نتیجے میں ــــ اس قتالہ لڑکی نے سنکھیا کھا کر جان دے دی تھی۔

بات تعلیم اور علم سے شروع ہوئی تھی اور پہنچ گئی حسن اور عشق تک۔ اب میں اپنے موضوع کی طرف واپس چلتا ہوں۔ ان کا غیر نصابی مطالعہ مضحکہ خیز حد تک متنوع اور حیران کن حد تک وسیع تھا۔ وہ ہر اس تحریر کو پڑھتے تھے جسے پڑھا جا سکتا ہو۔ وہ عموماً کسی پیڑ کے گدّے پر بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے تھے اور نیچے فیلڈ پر ان کے بھائی چندن اور چھبن (سید محمد تقی) اور محلے کے دوست کرکٹ کھیل رہے ہوتے تھے۔ وہ کوئی کھیل کھیلنا نہیں جانتے تھے، اور نہ انھیں کھیلنے کا شوق تھا۔ کاش انھیں

کھیلنے کا شوق ہوتا رہے یوں کہ انھیں مستقبل میں بہت گمبھیر کھیل کھیلنا تھا۔

انھوں نے

۱۹۸۸ء تک جن اصنافِ ادب، قدیم علوم اور جدید ترین سائنسی موضوعات کا بہت توجہ یا مناسب توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا، ان کا تنوّع حیرت اور "سنجیدہ ہنسی" کا ایک معقول سبب ثابت ہو سکتا ہے۔

اصل سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کیا پڑھتے تھے، اصل سوال یہ ہے کہ وہ کیا نہیں پڑھتے تھے۔

ان کے موضوعاتِ مطالعہ کی فہرست کم و بیش یہ ہے۔

داستان (طلسم ہوشربا اور دوسرے طلسماتی سلسلے) اردو اور فارسی کے دواوین، ہندوستان، اسلامی ممالک اور عالمی سیاسیات کی تاریخ، مغربی جاسوسی ناول، معاشیات، ہومیوپیتھی، مقاتل (واقعاتِ کربلا سے متعلق کتابیں) یوگا، اردو اور فارسی شاعروں کے تذکرے، سحر و نیرنجات، سیاسی دنیا کے اکابر کی خودنوشتیں، دیومالا، نفسیات، تصوف، زرعیات، جنسیات، معجزاتِ ائمہ، ٹیلی پیتھی، مابعد النفسیات، علمِ وظائفِ اعضا، مسمریزم، حیاتیات، علم جفر، طب یونانی، علم نجوم، دماغیات (NEUROLOGY)*، دست شناسی، مکانیات (SPACE SCIENCE)، افسانے اور ڈرامے۔

ڈرامے پر مجھے یاد آیا کہ انھوں نے ایک ڈراما لکھا

اس ڈرامے کا نام "کارنامۂ شمشیر" تھا۔

یہ ڈراما ہماری برادری کے ڈراما کلب "بزمِ حق نما" کے اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔

یہ جنگِ عظیم دوم سے کئی برس پہلے کے خواب آگیں، اسرار آئیں اور خیال آفریں امروہے کے ایک موسم بہار کا ذکر ہے۔ اس امروہے کے کھنڈروں کو بھی فنا ہوئے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ اس کی یاد کی پرچھائیاں بھی دلوں سے جلاوطن ہو چکی ہیں۔ اب حافظے کے اندھے افق میں،

---

* NEUROLOGY کا ترجمہ اعصابیت کیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں دماغیات زیادہ صحیح ترجمہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل غلط ترجمہ ہو۔

صرف اندھیرا ہے۔ اندھی آنکھیں اور اندھیرا: تم کون تھے، تم کہاں تھے، تم کیوں تھے؟

آسماں پر چاند تاروں کی صفیں تھرا گئیں
شب کے تہ خانے میں دو پرچھائیاں ٹکرا گئیں
میری جانب بڑھ رہی ہیں ان گنت پرچھائیاں
اَن گنت پرچھائیاں، تم آ گئے، تم آ گئیں!

(رئیس امروہوی)

میں اس ڈرامے کا پہلا سین پیش کرنا چاہتا ہوں۔ رئیس امروہوی کے دادا سید ابدال محمد کے سگے بڑے بھائی نواب سید محمد شاکر کے شمال رویہ دیوان خانے کا وسیع و عریض صحن ہے اور اس صحن کی مغربی دیوار کے پیچھے کشت زاروں اور باغوں کا ایک شاداب اور گہرے سبز رنگ کا سرسبز سلسلہ ہے جو لہکتا اور لہلہاتا ہوا احساس اور تاثر کے لامحدود افق میں گم ہو گیا ہے۔
صحن میں امروہے کی چوتھی دہائی کے ابتدائی برسوں کے سیکڑوں شہری بیٹھے ہوئے بیتابی کے ساتھ تیسری گھنٹی کے بجنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے ایک بلند ہیکل کا اسٹیج اپنے پُراسرار جلال میں استادہ ہے۔ پردے کے پیچھے تیسری صدی ہجری کے عراقی کردار اپنے اپنے لباس پہن رہے ہیں تلواریں باندھی، آزمائش کے لیے سوتی اور میان میں کی جا رہی ہیں۔
تیسری گھنٹی بجتی ہے۔ دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دینے والا ایک دھماکا ہوتا ہے اور پردہ اٹھتا ہے۔

پہلا سین:
جنگل اپنے سناٹے میں گم ہے۔

تیسری صدی ہجری کے عراق کا ایک مہیب کردار بہبود (۱) جس کے سر کے گرد ایک سانپ کنڈلی مارے اور پھن کاڑھے بیٹھا ہے، جیسے وہ پھن اس کے تاج کی کلغی ہو۔ اس کے گلے میں انسانوں کی ہڈیوں کا ایک ہار پڑا ہے۔ اسکے بٹے ہوئے بالوں کی لٹیں اس کے شانے کو چھو رہی ہیں۔ ان کی پنڈلیوں سے دو سانپ لپٹے ہوئے ہیں) بائیں ہاتھ سے اپنا سیاہ لبادہ سمیٹے ہوئے اپنے ایک معتمد کے ساتھ جو اس کے پیچھے چل رہا ہے، اسٹیج کے شمالی پہلو سے گرجتا ہوا اسٹیج پر وارد ہوتا ہے اور پہلے ہی لمحے پوری فضا میں نافذ ہو جاتا ہے۔

"ہلا دو، ہلا دو، زمین اور آسمان کی بنیادوں کو ہلا دو۔ اور دشمنوں کے خوں میں سمندر میں دشت وجبل کو بہا دو۔ کون ہے جو میرے مقابلے پر آئے اور جیتا بچ جائے۔ میری ہم سری اور پھر جاں بری؛

ہمسری مجھ سے کرے آج جگر کس کا ہے؟ میری قدرت کا نہیں پھر یہ اثر کس کا ہے

دشت و دریا و جبل کس کے لیے خلق ہوئے آج سرسبز حکومت کا شجر کس کا ہے!"

بڑے بھائی کے ڈرامے کا یہ لہجہ ان کی باغیانہ اور انقلابی شاعری میں ایک عجیب فرد۔ شکوہ کے ساتھ طنطنہ پرداز ہوا ہے۔ میں اس کے بارے میں حسبِ موقع کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے میں ان کے ادبی گرد و پیش کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے ماحول پر فارسی شاعروں کا ایک عجیب رعب طاری تھا۔ شام کی ادبی محفلوں میں رودکی، فردوسی، فرخی، منوچہری، دامغانی ——— مولانا روم، حافظ، عرفی، فیضی، نظیری، ناصر علی، غنی کاشمیری اور شیخ علی حزیں میں سے تقریباً روزانہ کسی نہ کسی شاعر کا مودبانہ اور سخن سنجانہ تذکرہ

(۱) بھائی نے بہبود کی شکل میں تیسری صدی ہجری کے عظیم الشان عوامی رہنما اور خلافت عباسیہ کی استبداد کے باغی علی ابن محمد کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کیا ہے علی ابن محمد عراق کے شورہ نکالنے والے سیہ فام مزدوروں (شورچیوں) اور کسانوں کا محبوب ترین قائد تھا۔ اسے تاریخ میں قائد زنج کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اگر مجھے صحیح نام یاد ہے تو مغربی مورخ پرسی سائیکس نے اپنی تالیف تاریخ اسلام میں لکھا ہے کہ علی ابن محمد کی بغاوت عظیم الرتبت اسپارٹیکس کی بغاوت سے کہیں زیادہ شدید تھی۔ اس بغاوت نے شہروں کے شہر بغداد کا رنگ فق کر دیا تھا۔

یا ان میں سے ایک قبیل کے دو شاعروں کا موازنہ ضرور ہوتا تھا۔ کبھی کبھی بات تلخی تک پہنچ جاتی تھی۔ بابا تصنیف و تالیف کے مختصر وقفوں میں روزانہ مولانا روم کا یہ شعر گنگنایا کرتے تھے اور اکثر اشکبار ہو جاتے تھے۔ ؎

موسیا آداب داناں دیگر اند　　　　سوختہ جانانِ جاناں دیگر اند!

بھائی کے نوخیز ذہن کے تخلیقی انفعال کی لوحِ محفوظ پر فارسی شاعروں کے نام درخشانی کی روشنائی سے تحریر تھے اور اس روشنائی کے پَرتو نے ان کے نفسِ کیفیت طلب کو ابداعی روشنی میں نہلا دیا تھا۔

مناسب ہے کہ اس سیاق کلام کے مطابق بھائی کی اردو شاعری سے پہلے فارسی شاعری کا مطالعہ کیا جائے۔ لیکن میں عرض کر دوں کہ یہ مطالعہ ناقدوں کے انداز کا تجزیاتی مطالعہ نہیں ہوگا، اس لیے کہ میں اپنی حیثیت کے اعتبار سے نقادوں کے رفیع ترین درجے سے بہت پست ہوں اور وہ یوں کہ میں ایک شاعر ہوں۔ سو یہ مطالعہ تاثراتی ہوگا۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر شاعری کا مطالعہ بھی تاثراتی نہ ہو تو کیا ELECTRONICS کا مطالعہ تاثراتی ہوگا۔

بھائی کی فارسی شاعری کا زیادہ حصہ قبل تقسیم کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے فارسی شاعری کے اُن دونوں اسلوبوں میں شاعری کی ہے جن میں سے ایک "سبکِ خراسانی" کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا "سبکِ ہندی" کے نام سے۔ رودکی، فرخی اور منوچہری دامغانی "سبکِ خراسانی" کے سب سے زیادہ نامور، نامدار اور نام آور سخن ور ہیں اور عظیم الشان رودکی، شاعرِ شاعراں رودکی کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ یہ نام جب کبھی ذہن میں آتا ہے تو سر جھک جاتا ہے عنصری نے کہا ہے۔ ؎

غزل رودکی وار نیکو بود
غزلہائے من رودکی وار نیست

سب سے پہلے رئیس امروہوی کے یہ دو شعر سنیے جو انھوں نے "رودکی وار" کہے ہیں؛

جستجو سوزِ لیست سوزِ جستجو!
شعلۂ زندہ بہ بخشد مردہ را
آرزو برقیست ، برقِ آرزو
مہر سازد ذرۂ افسردہ را

کیا یہ دو شعر رودکی کے طراز سے کمتر طراز اور لفظوں کی وحدتیوں کے جمالیاتی ایتلاف کے اعتبار سے کمتر حسن ایتلاف کے شعر ہیں؟

اب رودکی کی اس شہرۂ آفاق نظم کا مطلع دیکھیے جس کی عدیم المثال مقبولیت کا رمز نہ تو دولت شاہ سمرقندی کی سمجھ میں آیا اور نہ بقراطِ قسم کے مستشرق ایڈورڈ براؤن کی سمجھ میں، عجب لوگ تھے ۔ افسوسناک حد تک عجیب!

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

اب اسی زمین میں رئیس امروہوی کے چند شعر سنیے! ان اشعار کا مطلع مجھے یاد نہیں رہا۔

؎ چشمِ بد دور آں مرادِ دوستاں بر مرادِ دوستاں آید ہمی !!
تا ز ایام جوانی بر خوریم یار با بختِ جواں آید ہمی
چوں سخن از خیلِ خوباں می زود ذکر خویش درمیاں آید ہمی

"مرادِ دوستاں ، بر مرادِ دوستاں ، ایامِ جوانی ، بختِ جواں" ... لفظوں کے ایقاع کو دیکھیے ہر حرف ، ہر لفظ ، ہر ترکیب اور ہر مصرع جدا جدا اور اپنی تالیفی نسبیت کے تناسب میں معنیٰ سے بہت آگے جا کر کیفیت کے حال انگیز آہنگ اور آہنگ کی حال انگیز کیفیت کے ایک ناقابل تعبیر مظہر کے وجود اور شہود میں متمثل ہو گئے ہیں۔

مجھے رئیس امروہوی کی فارسی شاعری پر "سبکِ خراسانی" کی نسبت سے کوئی

تفصیل قلم پردازی نہیں کرنی۔ ظاہر ہے کہ عظیم الشان رودکی کے بعد دبستانِ سبک خراسانی کے دوسرے شاعروں کی شاعری کی نسبت سے رئیس امروہوی کی شاعری کا جائزہ لینا ایک بہت ہیچ اور پوچ بات ہے مگر ایک چیز ہوتی ہے شوقِ فضول یا شوقِ فزوں، چنانچہ اس کا تقاضا مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں سبک خراسانی کی نسبت سے رئیس امروہوی کی شاعری کے بارے میں مزید چند سطریں رقم کروں۔

انیسویں صدی کے ایران میں سبکِ خراسانی کے احیاء کی تخلیقی تحریک وجود میں آئی صباحی بیدگلی، صبا کاشانی اور حکیم قاآنی اس کے نمودار ترین نمایندے تھے۔ قاآنی کی شکل میں تو جیسے فرخی دوبارہ پیدا ہوگیا تھا۔ یہاں مجھے قاآنی کی ایک پُرآہنگ نظم کے دو شعر یاد آرہے ہیں:

ساقی بدہ رطلِ گراں زاں مے کہ دہقاں پرورد

اندہ بردغم بشکرد، شادی دہد جاں پرورد

در غم دلِ پیرِ مغاں در جام مَہرِ زر فشاں

در دست ساقی قوتِ جاں رخسارِ جاناں پرورد

اب میں رئیس امروہوی کے دو شعر گنگنانا چاہتا ہوں؛

ے مے بہ کامِ ہوش منداں مایۂ عرفاں شود

کردگارِ تن شود، پروردگارِ جاں شود

مے بہ کامِ دل براں ایفاے صد پیمانِ ناز

مے بہ جامِ عاشقاں تاراجِ صد پیماں شود

—————— آپ قاآنی اور رئیس امروہوی کے شعروں کو دوبارہ پڑھیے۔ قاآنی کے شعروں کی صرف ایک تہ ہے اور رئیس امروہوی کے شعر تہ دار ہیں۔

"کردگارِ تن" اور "پروردگارِ جاں" کی ترکیبوں کو دیکھیے اور حالتِ حال میں آجائیے۔ "ایفائے صد پیمانِ ناز" اور "تاراجِ صد پیماں" کے تضاد سے اور "کامِ دلبراں" اور "جامِ عاشقاں" کی کیفیت سے خاص طور پر لطف اندوز ہونا نہ بھولیے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ قاآنی کے یہاں صرف اظہار کی فضا آفرینی پائی جاتی ہے اور رئیس امروہوی کے یہاں احساس اور اظہار دونوں کی فضا آفرینی کا طور پایا جاتا ہے۔

سبک خراسانی کی نسبت سے رئیس امروہوی کے چند اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد اب میں فارسی شاعری کے سب سے زیادہ پُرفن، نکتہ آفرین، تہ در تہ، "پیچ طرۂ ژولیدہ" کے مصداق، پُرکارانہ ترکیب ساز طورِ شعرگوئی یعنی سبکِ ہندی کی طرف آتا ہوں۔ یہ دبستانِ شعر معنی پردازی، ژرف نگہی، پہلوداری، نادرہ کاری، خیال آفرینی اور فکر آگہی کے تمثّل سے عبارت ہے۔ اس دبستان کے بانی بابا فغانی تھے۔ ان کے طرزِ سخن کو "تازہ گوئی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آغا بابا فارسی غزل کی تاریخ کے "مردِ بے عجیب" تھے۔ ان کے طورِ سخن نے شاعری کے عالم کو ایک عجیب ازل اور ابد سے نوازا ہے۔

اب رئیس امروہوی سبکِ ہندی کی مشاعرہ گاہ میں وارد ہوتے ہیں اور ملک الشعراء فیضی، ماجرا طلب عرفی اور آزمودہ کار نظیری سے معانقہ کرتے ہیں۔ تخلیق کی کئی صدیاں شعر و سخن کی ایک محفلِ شبانہ میں سمٹ آتی ہیں۔ عرفی اپنی حالتِ انا میں سخن سرا ہوتا ہے:

من کہ بستم آں سالک کونین مسیرم!
کنز بجنۂ جوہرِ قدس است خمیرم
می گویم و من باک نہ دارم ز حسد یفاں
من زہرۂ راش گر د من بدرِ منیرم

عرفی کے سلسلۂ مفاخرانہ کے دو شعر سننے کے بعد رئیس امروہوی عرفی ہی کی جیسی انانیت

اور نرجسیت کی حالت میں لب کشا ہوتے ہیں :

از سیہ بختیِ یارانِ سفر باکم نیست　　دارثِ حسن کلیم ید بیضا دارم
زیں ہمہ مجد و شرف ہیچ اثر نیست کہ من　　طلعتِ یوسف و تقدیرِ زلیخا دارم

سحرؔ ، کی اسی فضا میں رئیس امروہوی کے دو شعر اور سنیئے :

منم آں کہ از خاکِ پاکِ عجم ام
چرا بر سلوے نژادے نہ نازم !

نہ فردوس و کوثر بسے پاک اصلم
نہ خورشید و انجم بسے سرفرازم

ان اشعار کو پڑھ کر ہم اس حقیقت تک رسائی حاصل کرتے ہیں کہ شاعری کا تقویم سے کوئی تعلق نہیں ہے ، اور یہ کہ تخلیقی عمل کی ایک جداگانہ تاریخ ہوتی ہے ۔ ایک ایسی جداگانہ تاریخ جو واقعات کی تاریخ کو اپنے میں ضم کر لیتی ہے ۔

اب ہم فیضیؔ کی ایک غزل سنتے ہیں ۔ یہ غزل اس نے دکن کے سفر کے دوران کہی تھی ۔ کیا عجب غزل ہے :

باز یارانِ طریقت سفرے در پیش است
رہ نوردانِ بلا را خطرے در پیش است

کس نہ می گویدم از منزلِ اوّل خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش است

ہمرہاں ایں ہمہ نومید نہ باشید از من!
کہ دعاے سحرم را اثرے در پیش است

فیضی از قافلۂ کعبہ رواں بیروں نیست
ایں قدر ہست کہ از ما قدرے دو پیش است

اظہارِ خیال اور فکر کی نسبت سے مختلف شاعروں کی شاعری کا جائزہ لینا اور مطالعہ کرنا ایک نصابی جائزے اور مطالعے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے عظیم المرتبت، ناقدین ایک زمانے سے اسی نوع کی افسوس ناک کارگزاری انجام دیتے چلے آرہے ہیں اور میں نے بھی اس دوران اسی نوع کی کارگزاری انجام دی ہے۔ اس نوع کے جائزے اور مطالعے میں مشترک بحر (آہنگ) کی نسبت سے مختلف شاعروں کی شاعری سے کوئی اعتناء نہیں برتا جاتا۔ جو مرموز شئے شاعری کو سحر اور اعجاز بناتی ہے، وہ بحر (آہنگ) ہے جو صرف 'صوری' اہمیت ہی نہیں رکھتی بلکہ معنوی، معنوی ہی نہیں کیفی قدر بھی رکھتی ہے۔ ہمارے نقادوں میں اس حقیقت کو سمجھنے کی کسی قدر اہلیت ضروری پائی جانی چاہیے کہ شاعری میں ترسیلِ معنی سے کہیں زیادہ ترسیلِ کیفیت کو اہمیت حاصل ہے۔ جہاں تک ترسیلِ معنی کی بات ہے تو نثر، شاعری کے مقابلے میں ترسیلِ معنی کی کہیں زیادہ استعداد رکھتی ہے۔

میں آہنگ کی بات کر رہا تھا۔ تو ہے یوں کہ کوئی شاعر کسی آہنگ یا بحر کے ساتھ تخلیقی شبِ وصال گزار رہا ہوتا ہے اور کوئی تخلیقی شبِ فراق۔ بہر حال اس لمحے مجھے دو شاعروں کے فن کے نسبتاً زیادہ بہتر جائزے اور مطالعے کا موقع مل گیا ہے اور وہ اس طرح کہ رئیس امروہوی نے بھی دکن جاتے ہوئے ایک غزل نما نظم کہی ہے، جس کا عنوان "سفر نامہ" ہے۔ یہ نظم یا غزل ۲۶ اشعار پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنی اس تخلیق میں فیضی کی زمین سے قدرے فرق کے ساتھ تخلیقی استفادہ کیا ہے۔ دونوں ایک ہی بحر میں آہنگ پرداز ہوئے ہیں۔ اور دونوں کا موضوع مسافرت ہے۔ یہ دو شاعروں کے دوہرے جائزے اور مطالعے کا ایک بہت سازگار موقع ہے، جو ہمیں میسر آ گیا ہے۔ سو ہمیں اس موقع سے متمتع ہونا چاہیے۔ میں کسی بھی انتخابی منصوبہ بندی کے بغیر اس غزل نما نظم کے چند شعر پیش کر رہا ہوں:

مژدہ اے ذوقِ طلب رنجِ سفر در پیش است
یک بیاباں بگذشتیم و دگر در پیش است

ہم صفیراں بہ چمن باز رسیدند و مرا
تاکنوں مرحلۂ جنبشِ پر در پیش است

کس نہ داند کہ دریں دشت دلِ وحشی ما
چہ قدر راہ برید و چہ قدر در پیش است

عجبے نیست اگر پائے نگہ می لرزد
ہر کجا می نگرم دیدۂ تر در پیش است

صدمۂ عالمِ ہجرت زکجا می دانند
خواجگاں را کہ ہمہ کیسۂ زر در پیش است

دلِ آشفتہ بہ بینی کہ ترا دشتِ جنوں
ہم چو ماتم زدگاں خاک بسر در پیش است

ہمرہاں در صددِ زادِ سفراند و مرا
زاشک ریزی مژہ سلک گہر در پیش است

پا بہ گل از اثر گریۂ یاراں گشتم!
بگذر آہستہ کہ خوں تا بہ کمر در پیش است

ہر کجا جوششِ جنوں می کشدم می تازم
من نہ دانم چہ قضا و چہ قدر در پیش است

"کس نہ داند...." "چہ قدر راہ...." اس شعر میں تاریخی عہد کے تکاں زدہ انسان کا سوال رقم کیا گیا ہے۔ ایک ایسا سوال جو خود بھی کچھ کم تکاں دہ نہیں ہے۔ "....پائے نگہ می لرزد"!"....دیدۂ تر"!

در پیش است"۔ ذرا اس مرکب تمثال کو ملحوظ رکھیے اور اس شعر کی حرکی کیفیت اور واقعہ آگینی کو احساس میں بسائیے اور رچائیے۔

"صدمۂ عالم ہجرت ....." "خواجگاں راکہ ....."۔ اس شعر میں شاعر، شاعر کیا تاریخ کا محروم انسان زندگی کی سخت اور کرخت حقیقت کی زمین پر غربت کی اذیت کے عالم میں پسینہ پسینہ دکھائی دے رہا ہے۔

"دل آشفتہ بہ بینی ..... دشتِ جنوں" "ہم چو ماتم زدگاں خاک بسر ....."۔ دشتِ جنوں کو من جملۂ ماتم زدگاں اور خاک بسر قرار دینا ایک ایسا طورِ تعبیر ہے جو شاعرانہ اور شعری تعبیرات میں ایک نادر ترین اور انتہائی پُراحساس تعبیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

"ہمرہاں ....." "سلکِ گہر در پیش است"۔ اشک ریزی کو سلکِ گہر محسوس کرنا اور اسے بیش بہا ترین زادِ سفر کے طور پر قبول کرنا احساس اور احساس پر ور رویّے کی وہ حالت ہے جس میں سود و زیاں اور نفع و ضرر کا اعتبار یکسر لایعنی ہو جاتا ہے اور تخلیق کار بلکہ صحیح تعبیر کے مطابق 'انسان' اپنے سود و زیاں اور نفع و ضرر کا خود تعین کرتا ہے اور یہ عمل وجودی اضافت کے اعتبار سے ایک خود انتخاب کردہ سزا بھی ہے اور خود بخشیدہ جزا بھی۔ لیکن ہے یوں کہ اس 'مطلقیت' یا اس بے چگونگی میں! نہ سزا ہی کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ جزا۔ یہ طورِ خاص تخلیق کے اس مرحلے میں حسابِ ذات اور حسابِ غیر ذات کی تفریق ایک یکسر عامیانہ اور مبتذل فعلیت بن کے رہ جاتی ہے۔

"پا بہ گل ....."۔"..... خوں تا بہ کمر در پیش است"۔ "اثرِ گریہ"۔ "بگذر آہستہ"۔ یہاں تمثالی اظہار، تمثال اور اظہار کے سہ بعدی وجود کو چہار بعدی امتداد سے نواز رہا ہے۔ یہ ایک ایسی موقعیت ہے جو ایک محشرِ بے شور و غوغا میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسا وقوعہ ہے جس کی کفالت صرف ایک سنگین سرگوشی ہی کر سکتی ہے۔

بگذر آہستہ کہ خوں تا بہ کمر در پیش است

من نہ دانم چہ قضا و چہ قدر در پیش است　　　ہر کجا جوشِ جنوں می کشدم می تازم

یہاں پہنچ کر شاعر (انسان) اپنے آپ کو اپنے آپ کے حوالے کر دیتا ہے اور اس طرح قضا اور قدر اپنا اعتبار کھو دیتے ہیں اور جبر و اختیار میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یہاں ایک اور طرزِ تعبیر بھی کار آمد ثابت ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ اختیار انسان کی مجبوری ہے اور مجبوری اس کا اختیار۔

یہ ۲۲ سالہ رئیس امروہوی کی غزل نما نظم تھی جو ملک الشعراء فیضی کی زمین میں (قدرے فرق کے ساتھ) کہی گئی۔ کیا ملک الشعراء فیضی اور کیا سید محمد مہدی رئیس امروہوی؛

ایں قلم ہیچ است و ایں قرطاس ہیچ

اب ہم رئیس امروہوی کے چند متفرق اشعار سے احساس اور تاثر کے ساتھ معاملت کرتے ہیں۔ لیجیے سب سے پہلے ان کی ایک غزل میرے سامنے آگئی ہے جو انھوں نے اپنے دادا نصیر امروہوی کی زمین میں کہی ہے۔ "ساماں تواں شناخت"، "گریباں تواں شناخت"!

ما راز چاکِ جیب و گریباں تواں شناخت

شورے کہ در سر است ز ساماں تواں شناخت

مطلع تو بس یوں ہی سا ہے۔ اب آپ اس غزل کے چند شعر سنیے اور سر دھنیے؛

اے راہ ناشناس پے راہ بر مگرد　　　منزل ز مشتِ ریگِ بیاباں تواں شناخت

آنچہ کہ گفت گفت و نہ گفت آنچہ حال دوش!　　　از شوخیِ نگاہِ پشیماں تواں شناخت

مرغ پریدہ ہوش نہ داند کہ در قفس　　　رفتارِ نبضِ گل ز رگِ جاں تواں شناخت

تو خود چمن شناس نہ ای ورنہ از خزاں　　　آوازۂ ورودِ بہاراں تواں شناخت

"منزل ز مشتِ ریگ بیاباں...." "از شوخیِ نگاہِ پشیماں...." "مرغِ پریدہ ہوش...." "رفتارِ نبضِ گل ز رگِ جاں...." "آوازۂ ورود بہاراں...." یہ اظہار اور گفتار کے وہ انفعال پرور اور تاثر انگیز مرحلے ہیں جہاں سخن اور سماعت کے درمیان

وہ ماجرا ساز رشتہ استوار ہوتا ہے جسے اظہار کا معروض قرار دینے کی کم سے کم ہمت کرنا بھی خاصا دشوار ہے ۔ منزل کو "مشتِ ریگِ بیاباں" کے ذریعے شناخت کرنا ۔ وہ ہنر ہے جو ابداعی انشاد کی تاریخ میں کم ہی ظہور پذیر ہوا ہے ۔ "شوخیِ نگاہِ پشیماں" کی فعلی اور انفعالی وحدیت کیا گفتار کا معجزہ نہیں ہے " مرغ پریدہ ہوش" کی ترکیب میں حرکت اور سکون کا تضاد کیسے عجیب کیفیاتی تطابق میں متمثل ہوا ہے ۔

ذرا یہ اشعار دیکھیے :

در رہِ شوق گراں مایہ و بس نادارم

زادِ رہ از گہرِ آبلۂ پا دارم

ہمہ معمورۂ آفاق پُر از خونِ وفاست

وائے برمن کہ دل و دیدۂ بینا دارم

"گراں مایہ و بس نادارم" ــــ "گہرِ آبلۂ پا دارم" ــــــــــــ میں جب اس نوع کے غیر منطقی اشعار سنتا ہوں اور انھیں اثر انگیزی اور احساس پروری کا ایک معجزہ محسوس کرتا ہوں تو مجھے اپنے اوپر بھی رحم آتا ہے اور تاریخ کے دبستانِ فلسفہ و فکر کے معلمِ اوّل ارسطو پر بھی تضاد، مطابقت، منافات اور تناقض یہ اصطلاحات لاکھوں برس پہلے کے غیر ذی عقل انسان کے لیے تو شاید قابلِ فہم اور قابلِ قبول ہو سکتی ہوں لیکن ارتقا یافتہ انسان اپنی احساساتی، جذباتی، تخیلاتی اور نفسیاتی زندگی کی حالتوں میں انھیں یکسر بے معنی پاتا ہے ۔

" ہمہ معمورۂ آفاق ..... " "وائے برمن ..... " ــــ تاریخ انسان کے خون میں نہائی ہوئی ہے اور اس انسان کے لیے جو دل و دیدۂ بینا رکھتا ہو زندگی ایک خوں گشتہ موجودیت کے سوا آخر اور کیا حیثیت رکھ سکتی ہے ۔ یہ ہے وہ شاعری جو ابداعی کلّیت کا ایک ایسا مظہر ہے جس کا اظہار کلّیت پسند فلسفے کے بس کی بات نہیں ۔ مشکل یہ ہے کہ منطق ہمیں سمجھاتی تو ہے مگر سمجھاتی نہیں ۔

دانی کہ نسیمِ سحر و نکہتِ گل چیست؟

برماز گل و غنچہ درود است و سلام است

مستِ نگہی! از نگہِ مست بیاموز

کیفے کہ حلال است و خمارے کہ حرام است

ایک غیر شاعر 'حیوانِ ناطق' کے لیے 'نسیم سحر' بہت فرحت بخش اور نکہتِ گل' بے حد خوشگوار ہوتی ہے لیکن شاعر کا معنی یاب انفعال غیر شاعر 'حیوانِ ناطق' سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ شاعر ایک چیز میں دو چیزیں اور ایک کیفیت میں ایک سے زیادہ کیفیتیں تلاش کرتا ہے اور انھیں پالیتا ہے۔ شاعر کے لیے 'نسیم سحر' اور نکہت گل' گل و غنچہ کے درود اور سلام سے عبارت ہیں۔ مختلف اشیاء کے درمیان یہ وہ احساس آگیں رشتے ہیں جنھیں شاعر ہی تلاش کر سکتا ہے۔

اب ہمیں ان کی ایک شگفت آور نظم کے ساتھ کچھ حال انگیز وقت گزارنا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "گفتم و گفت"۔ یہ نظم ابوالعلا معرّی کے "رسالۃ الغفران" دانتے کے "طربیۂ الوہی" (DEVINE COM-EDY)، پارسیوں کی متقدس کتاب "اُردی ویراف نامہ" اور اقبال کی بلند پایہ تخلیق "جاوید نامہ" کے قبیل کی تخلیق ہے۔ مذکورہ تخلیقات میں عالم بالا یا "جابرصا" اور "جابلقا" کے روحی سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔ "گفتم و گفت" اپنے مزاج میں "رسالۃ الغفران" سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں میں قابل ذکر حد تک اذعان اور ایقان کی کمی یا تشکک کی کیفیت پائی جاتی ہے اور یہی ان کا فکری اختصاص اور امتیاز ہے۔

یہ نظم بحرِ رمل میں ہے اور بحرِ رمل بڑی ظالم بحر ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔ شعر و سخن کے معاشرے کے خواص و عوام اس بحر کو مثنوی مولانا روم کا اختصاص سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا روم نے اس بحر کو کمال سلیقے سے برتنے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ بڑے پھوہڑپن کے ساتھ برتا ہے۔ انھوں نے جہاں عربی عبارتیں استعمال کی ہیں وہاں اکثر اس جانِ آہنگ اور آہنگِ

جار) بحر کا ستیاناس کر دیا ہے ـــ اس بحر کو مولا‘‘ م سے تقریباً ساڑھے تین سو برس پہلے شاعری کے جس نفسِ نفیس نے معجزانہ پیرایش کے ساتھ ’جاوید آہنگ‘ بنایا، وہ رودکی ہے، بابائے سخن حضرتِ رودکی۔

’’گفتم وگفت‘‘ اس طور نمو کرتی ہے۔

چوں پریدم از مکان و لامکان | پر کشودم در فضائے بے کراں
از حدوث و از قدمِہائے نیاز | از ازلہا و ازابدہائے نشاں
چوں حجاب کن فکاں برداشتم | دیدم اندر پردہ بے کن فکاں
مجمع روح الامیناں صف بہ صف | سر بروں آور دپیرے زاں میاں!

نظم کا پہلا شعر اعجاز کا اعجاز ہے۔ شاعر عالم ناسوت سے سفر کا آغاز کرتا ہے اور یک بارگی عالم ناسوت کے ماورا، (فضائے بے کراں میں) پرکشا نظر آتا ہے۔ ’’فضائے بے کراں‘‘ کی ترکیب میں ’’فضا‘‘ محض وزن و بحر کی مجبوری ہے، ایک ایسی فنی مجبوری جسے عزّت مآب نقاد سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بات یہ ہے کہ ’’چوں پریدم از مکان و‘‘ کے بعد ’’لامکاں‘‘ اور..... ’’بے کراں‘‘ سے ’’فضا‘‘ کی نسبیت اور اضافت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہا ’’از مکان ولامکاں‘‘ کا عطفی رشتہ تو اس میں ’ این کے مقولے (کم وبیش) کے ساتھ تخفیفِ قدر کا وہ سلوک اختیار کیا گیا ہے جو ارسطو اور اسکندر افرودیسی کے لیے ناقابل برداشت حد تک اشتعال انگیز ثابت ہو سکتا تھا۔ ’’از مکان ولامکاں‘‘ میں صرف حرف ’’و‘‘ کے ذریعے اینیت کا قرضہ چکایا گیا ہے۔

اس کے بعد ’’قدمِہا‘‘، یعنی قدم کی جمع خصوصی طور پر داد طلب ہے۔ کیا مابعد الطبیعیات جو تصوریتی فکر کی معراج ہے اور مذاہب جنھیں تخیل کے مقدس فن میں معجزانہ کمال حاصل ہے ’’قدمِہا‘‘ کی تعبیر پر قادر ہیں؟

جناب افلاطون، جناب افلوطین اور حضرت پاپائے اعظم! یہ شاعری حرّافہ تو آپ کی

اکادمی اور آپ کے کلیسا میں دندناتی ہوئی داخل ہوگئی ہے اور شہ نشین میں بیٹھی ہوئی گنگنا رہی ہے۔ اُسے نہ آپ کی دلیلوں کی پروا ہے اور نہ آپ کے فتووں کی۔ وہ تو اپنے نفس ابداعی کی کیفیت پذیری سے سرشار ہے اور اسکے تنفس کے ترنم کا زیر و بم دلوں کو نشۂ وجود سے حال مست کر رہا ہے۔

"پردۂ بے کن فکاں" کی ہیئت نے "سبے کن فکاں" کو ایک کیفیت پرور تمثال سے پُرمایہ کیا ہے۔ میں اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لیے ایک اور اسلوب اختیار کرنا چاہتا ہوں "پردہ" مضاف ہے اور ایک ایجابی مفہوم رکھتا ہے اور "بے کن فکاں" ایک سلبی مفہوم ہے۔ اس ایجابی اور سلبی مفہوم کی اضافت نے وہ تحیری ہنر کر دکھایا ہے جو صرف شاعری سے مخصوص ہے' صرف اور صرف شاعری سے۔ اس ہنر پردازی کی سکت نہ کسی علم میں پائی جاتی ہے اور نہ کسی فن میں ——

"پردۂ بے کن فکاں" سے ایک اور سلسلۂ سخن بھی جاری ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آیا عالم مفارقات کی کوئی علت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ "پردۂ بے کن فکاں" کی عباریت اس سوال کا نفی میں جواب دیتی ہے۔

"روح الامیناں" اک عجب طور کی سخن گزاری ہے۔ اس سخن گزاری نے روح الامین کے ملکوتی تشخص کو یکسر سلب کر لیا ہے۔ عالم مجردات یا عالم ملکوت (=جابرصا = جابلقا) میں سامی مذاہب کے ناقابل تنسیخ قوانین کی رو سے ملائکہ اور صرف ایک روح الامین کو شہریت کا حق حاصل ہے۔ "روح الامیناں" ایعنی چہ؟

"پریدم"۔ "پرکشودم"۔ "قدمہا"۔ "ازل ہا" اور "ابدہا"۔ کے متحرک اور ساکن حروف کی نوا طرازی اور "....ہا.....ہا" اور "......ہا" کی وجد آور سرود سامانی اک عجب طور کی حالتِ حال پیدا کر رہی ہے، اک عجب طور کی حالتِ حال کہ سیاروں کو بھی حال آئے۔ اب ذرا ان لفظوں کا لحنی اور صوتی تجزیہ کیجیے۔ پری، دم'۔ پرکشو' دم۔ یقدم دم، بقدم'، ہا ازل، ہا ابد، ہا'۔

اب نظم کا اگلا حصّہ ہمارے تاثر کے گرداگرد اپنے آہنگ کی حلقہ بندی کر رہا ہے۔ شاعر روح الامین (یکے از روح الامیناں) کی خدمت میں چند معروضات پیش کرتا ہے۔

گفتم اے روح الامیں وحی ام بدہ — گفت تو روح الامینی خود بخواں !

گفتم اے ملہم زالہام بگو — گفت الہام است نطق جاں بہ جاں

گفتم اصلِ شاہد و مشہود چیست — گفت خود بیں شو بہ چشمِ امتحاں

گفتم اسرارِ شہود از من بگو — گفت مشہودے نیابم درمیاں

"..... تو روح الامینی، خود بخواں"۔ "نطقِ جاں بہ جاں"۔ "اصل شاہد و مشہو.......

"..... خود بیں شو ....." "..... اسرار شہود ..." "مشہودے نیابم درمیاں"

نظم اپنے کمون و بروز میں جاری ہے:

"گفتم و گفت" کے سلسلۂ کلام نے دو مسئلے چھیڑ دیے ہیں جو منطقی ایجابیت (Logical Positivism) کے نزدیک مسئلے قرار پانے کا ادنیٰ حق بھی نہیں رکھتے۔ مجھے اس موقف سے کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ میں اس سے اتفاق رکھتا ہوں لیکن ہمیں یہاں شعبوں کی واضح تفریق سے کام لینا پڑے گا۔ معاملہ منطقی ایجابیت کا نہیں ہے، شاعری کا ہے اور منطقی ایجابیت ہو یا شاعری اور دوسرے ابداعی فنون دونوں کو ذہن پر یکساں حق حاصل ہے۔

"روح الامیناں" میں سے ایک روح الامین عالم ناسوت کے باشندے سے ایک پُرطور بات کہتا ہے، ایک عجب پُرطور بات اور وہ یہ کہ اے ناسوتی، تو خود روح الامین ہے۔ تو خود وحی خواں ہو۔

"نطقِ جاں بہ جاں" الہام والقا کی وہ غیر ما بعد الطبیعی تعبیر ہے جو فارسی اور اردو شاعری میں ڈھونڈے بھی نہ ملے گی۔ اس کی ایک اور معنویت بھی ہے جو آگے چل کر معرض اظہار میں آئے گی۔

"..... اصل شاہد و مشہود چیست؟" یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے ایک سے زیادہ جواب دیے جا سکتے ہیں۔ روح الامین اس سوال کا بہت بجز اور بہت بار دار جواب دیتا ہے۔

یعنی "خود بیں شو" وہ اپنی حیثیت عرفی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی جواب دے سکتا تھا۔ شاعر تاڑ جاتا ہے کہ عالم مفارقات یا عالم مجردات (۔ جابر صا۔ جابلقا) کا رکن رکین کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اے ناسوتی! شاہد و مشہود تیری دنیا کی زبان میں دو جدا معنی رکھتے ہیں۔ مگر تو خود بینی سے کام لے اور دوئی سے دوری اختیار کر۔ اس سلسلۂ کلام کا بے حد اشتہائی اقتضا یہ ہے کہ 'ویدانت (Vedanta) غناسطیت، ـــــ (Genasticism) ہرمیسیت، اولیٰ خالی شیعیت اور اس کے شاگرد رشید یعنی فلسفیانہ تصوف ـــــــــــ پر ارتکاز ذہنی کے ساتھ کلام جاری کیا جائے۔ مگر میں ردا روی کی بے طور حالت سے دوچار ہوں اور مزید یہ کہ زیر بحث موضوع سے تعلق رکھنے والی میری تمام کتابیں دربدری کی نذر ہو چکی ہیں۔ میں صرف اپنے تباہ شدہ حافظے پر اکتفا کر رہا ہوں۔

روح الامین کا یہ جملہ دوبارہ سنیے "خود بیں شو" یہاں سے روح الامین اور شاعر کے درمیان ایک بے تکلفانہ سا تعلق شروع ہو جاتا ہے۔ شاعر پھر ایک اور معروضہ پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ "اسرارِ شہود از من بگو"

روح الامین اپنی ساری حرکات اور سکنات کے بارے میں عالم قدس کے باشندوں کی قدسیتِ علیا کے سامنے جواب دہ ہے۔ چنانچہ وہ شاعر کے معروضے کو سن کر خالص موقع شناسانہ سیاسی (Diplomatic) انداز میں یہ بیان دیتا ہے کہ "مشہود ے نیا بم در میاں"۔

"مشہود ے نیا بم در میاں" کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر شہود کا آخر کیا مفہوم ہے؟ اسرار شہود کے آخر کیا مفاہیم ہیں؟ "تصوف اپنی اصطلاح میں یہ کہہ کر مطمئن ہو جائے گا کہ "شہود" رویتِ حق بہ حق سے عبارت ہے لیکن مسئلے اصطلاحوں سے واضح نہیں ہوتے۔ اصطلاحات کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ ہم مسئلہ فہمی اور مسئلہ فہمانی کی استطاعت سے محروم ہیں۔

"شاہد و مشہود" کی واوِ عاطفہ محض قواعدِ زبان کا ایک نچلا نصابی معاملہ

ہے۔ کون شاہد ہے اور کون مشہود اُس بات کا تعین آخر کون کرے گا، آخر کون ؟ کیا رئیس امروہوی کے گھر کی کابک کا کوئی شیرازی کبوتر یا خود رئیس امروہوی ؟

اس گفتار میں فکر و فن کی ایسی سازندگی صورت پذیر ہوئی ہے جس کی مجموعیت ایک ایسا تخلیقی مظہر یہ ہے جو تفکر، تخیل اور اسلوبی اعتبار سے تقریباً نادر ہے۔

اب ہم نظم کے صوری اور معنوی آہنگ سے کیفیت پذیر ہوتے ہوئے اگلے مرحلے تک پہنچتے ہیں:

گفتم ایں بود و نبود و ہست و نیست؟ گفت میزانِ وجودِ این و آں
گفتم از احوالِ کفر و دیں بگو گفت ہر دو عالمِ روحانیاں
رستگاری نیست کس را زیں دو بخت یا چنیں قسمت شود یا آں چناں

بود و نبود . . . . . کو تعریف کا معروض بناتے ہوئے، انھیں میزانِ وجودِ این و آں کہنا، تعریف اشیاء کا وہ منہج ہے جس کا ارسطو، اسکندر افرودیسی، فرانسس بیکن اور مِل میں سے کسی بھی معتبر "حیوان ناطق" کے ہاں نام و نشان تک نہیں ملے گا۔ مگر شاعر نے اپنی قلندرانہ سہل انکاری کی حالت حالت میں وہ کچھ کہہ دیا ہے جو کہہ دیا ہے۔

"....احوال کفر و دیں...." "ہر دو عالم روحانیاں" "رستگاری نیست...." "زیں دو بخت" "ایں جہان راز چیست؟" "رازے از جہان جاودان"

یہ نظم کا ایک بحث طلب حصہ ہے۔ اس حصے کے دوسرے اور تیسرے شعروں نے ہمیں دو مسئلوں سے فراغت بخشی ہے یعنی ایک تو کفر و دین کی منافات کو مسترد کر دیا ہے اور دونوں کو "عالم روحانیاں" یا "حالتِ روحانیاں" قرار دیا ہے اور دوسرے یہ کہ "بخت" و "جبریت" کے ذریعے مختلف مسلکوں کے وجود کی توجیہہ کی ہے۔

مسلم معاشرے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کفر و ایمان کی تفریق کو تصوف نے دور کیا لیکن

یہ خیال درست نہیں ہے۔ وہ 'باطنیت' ہے جس نے کفر وایمان کی دوئی سے انکار کیا اور "دین کل" کے مسلک کو فروغ دینے کی کوشش کی۔

"بخت" یا مقسوم کی رو سے ہم دو متضاد عقیدوں یا نظریوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔

میرا عقیدہ یا نظریہ ہو یا تمہارا عقیدہ اور نظریہ۔ یہ دونوں میرا اور تمہارا انتخاب نہیں ہیں جبر ہیں۔ میرا عقیدہ یا نظریہ کسی اور قسم کی تکییف (Conditionality) کا نتیجہ ہے اور تمہارا عقیدہ یا نظریہ کسی اور قسم کی تکییف کا۔ یہ مابعد الطبعیاتی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ فرد کے ہونے کی کیفیت' اس کے اعصابی نظام، اس کے موروثی یا ذاتی مرض، اس کے گرد وپیش اور تعلیم وتربیت، اس کے ماضی اور حال کی نوعیت اور اس کی معاشی، سیاسی اور اجتماعی نسبیات سے تعلق رکھتا ہے۔ غالباً عمرانیات اس ترکیبی حقیقیے کی نسبتہً ایک جامع تعبیر قرار پا سکتی ہے۔

اس کے بعد ہمارے اور تمہارے درمیان کسی بھی بحث وجدال کا جواز باقی نہیں رہتا۔ ہے یوں کہ ہم اور تم کسی نہ کسی قسم کی رائے رکھنے پر مجبور ہیں۔ تمھیں کوئی اور رائے رکھنی ہے اور مجھے کوئی اور رائے۔ جو دلیل تم اپنے عقیدے یا نظریے کے حق میں پیش کرتے ہو وہ تمہارے نزدیک بلاشک وارتیاب درست ہے۔ یہ ایک بہت خوشگوار اور ناخوشگوار حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی بھی مشترک اور متفق بین الفریقین نظام استدلال کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا۔ یعنی ایسی کوئی منطق وجود نہیں رکھتی جسے ہم انسان گیر کہہ سکیں۔

| | |
|---|---|
| گفتم آخر ایں جہان راز چیست؟ | گفت رازے از جہانِ جاوداں |
| گفتم از یزداں نشاں جستم بسے | گفت از آدم نہ می یابم نشاں |
| گفتم از ترکیبِ جسم وجاں بگو!! | گفت روحے در تن وجسمے بہ جاں |
| گفتم آں تکوین آں کن از چہ بد؟ | گفت ایں را کس نہ می داند، بداں |

چوں بہ خلقش آفریں گفتم، بہ گفت — آفریں بر آفرینش ہا مخواں
جوہر آئینہ پنہاں شد ز چشم — زنگ بر ریش ہمی بینم عیاں
آفرینش چیست؛ زنگِ آئینہ — صورتِ زنگار را جوہر مخواں

"جہانِ راز"۔ "رازے از جہانِ جاوداں"۔ فلسفہ و تصوف کے نزدیک کائنات کوئی "جہانِ راز" نہیں ہے۔ افلاطونیت، نو فلاطونیت اور اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی تصوریت کائنات کی حقیقی موجودیت ہی کے منکر ہیں۔ رہا تصوف تو اسکا پرجوش نعرہ (Slogan) ہی ہے کہ "لاموجود الا اللہ" ویدانیت (Vedanta) بھی تصوف کی ہم زبان ہے۔ لیکن سائنس کائنات کو 'جہانِ راز'، یا دوسرے لفظوں میں مرموز کائنات سے تعبیر کرنے لگی ہے۔ شاعر اُسے "جہانِ راز" کہتا ہے اور اس کی ماہیت جاننا چاہتا ہے۔ روح الامین شاعرانہ طرز سے زیادہ شاعرانہ طرز میں اسے "رازے از جہان جاودان" قرار دیتا ہے۔ اس تعبیر کی رُو سے ایک جہان کی بجائے دو جہان پائے جاتے ہیں۔ ایک "جہانِ راز" دوسرا "رازے از جہانِ جاوداں"

پلٹ کے مصرع لگانے کی ذرا داد دیجئے۔ "جہانِ راز"، "رازے از جہان...."۔ رودکی کے بعد فارسی اور اردو میں اس ہنر کا اُن سے زیادہ تردست ہنرمند اور کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انھیں اظہار کے اس جمالیاتی ہنر میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے اس کمال کا اتنے تواتر کے ساتھ مظاہرہ کیا ہے کہ وہ ان کی شاعری کی پہچان بن گیا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میں نے یزداں کو بہت تلاش کیا (مگر نہ پایا)۔ اس کی خواہش ہے کہ روح الامین اس سلسلے میں اس کی کچھ مدد کرے۔ مگر روح الامین یہ بات سُن کر بدمزہ ہو جاتا ہے۔ اور انتقاماً یہ کہتا ہے کہ مجھے انسان کا کوئی نشان نہیں مل رہا۔ ان دونوں کے مجموعی بیان کے مطابق نہ یزدان کوئی دریافتہ حقیقت ہے اور نہ انسان۔ شاعر موضوع بدل کر روح الامین سے کہتا ہے کہ مجھے جسم و جاں کی ترکیب کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ آخر مادے اور روح کا اتصال یا اتحاد

کیسے ہو سکا۔ شاعر کا یہ مسئلہ فلسفیانہ نوعیت رکھتا تھا۔ لیکن روح الامین کا شعبۂ فلسفہ سے کوئی سرسری سا تعلق بھی نہیں تھا مگر اس نے جو کچھ کہا اسکے بارے میں دل سے جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ گفتہ و در سفتہ۔ اس نے جسم و جاں کی ترکیب کے بارے میں شاعرانہ طور کا سخن اختیار کیا اور سخن گستری کا کمال کر دکھایا۔ ذرا دیکھیے تو سہی 'روح جسم میں اور جسم روح میں۔ واہ واہ وا۔

اب گفتگو میں زیادہ سنجیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر بے صدا ہم سوال کرتا ہے"...... آن تکوین واں کن ....؟" آخر کائنات کی غایت کیا ہے؟ روح الامین جواب دیتا ہے کہ یہ بات کوئی نہیں جانتا یعنی شاعر اور روح الامین دونوں ہی لاادری (Agnostic) ثابت ہوتے ہیں۔

"چوں بہ خلقش آفریں گفتم ...." شاعر روح الامین سے خدا کی تخلیق یعنی کائنات کی تعریف کرتا ہے۔ روح الامین یہ تعریف سن کر عجیب بات کہتا ہے اور وہ یہ کہ کائنات کی تعریف و تحسین نہ کر اس کے بعد وہ کائنات کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے، وہ شنیدنی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کائنات کی وجہ سے آئینۂ وجود کا جوہر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے اور مجھے اس آئینے پر بس زنگ ہی زنگ نظر آتا ہے۔ یہ کائنات زنگِ آئینہ کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہے۔ اے ناسوتی! زنگ کو جوہرِ آئینہ تو نہ کہہ۔

"روحِ دہر؟"...."آزاد از قیدِ مکاں:" "دہر ہیچانیست ......؟" "ہر زماں پیدا و پنہاں"۔

—— کائنات کی اصل اصل کیا ہے؟ یہ ایک سوال ہے ایک قدیم ترین اور پیچیدہ سوال۔ اس سوال کا جواب اس سے زیادہ پیچیدہ ہے یعنی یہ کہ روحِ دہر یا کائنات کا جوہر مکان" (Space) سے آزاد ہے۔

یہ سوال اور اس کا جواب دونوں وحدتِ وجودی تصوف سے تضاد کی نسبت رکھتے ہیں، جبکہ اس نظم کے بعض اشعار پڑھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ ان کا وحدتِ وجودی تصوف سے براہِ راست قسم کا تعلق ہے۔

کائنات غیب و شہود کی پرخاش اور پیکار نہیں ہے۔ وہ جس آن میں مشہود ہے اسی آن غیر مشہود ہے۔ اس موقع پر ہرقلیطاس (Heraclitus) کے کائناتی تصور کا خیال آتا ہے اور یہ کہ اس مرحلے پر غیب و شہود دو مترادف لفظوں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان دونوں کا منذ بینی اعتبار و تعین ختم ہو جاتا ہے یہی نہیں بلکہ ہمیں گفتار کی یہ منطق اس اسلوبِ فکر تک پہنچاتی ہے کہ جو موجود ہے وہ اسی آن معدوم ہے اور جو معدوم ہے وہ اسی آن موجود ہے۔

سلسلۂ کلام جاری ہے۔ روح الامین کہتا ہے کہ اے ناسوتی! تیرا علم چاہے ہندی ہو یا یونانی، یہ دونوں دل و جاں کے عقدے حل نہیں کر سکتے۔ صرف "عشق رنج آموز" اور "عقل رائیگاں" ہی دانشِ جاں اور فروغِ دل ہیں۔ عقل "عشقِ حقائق" سے استوار ہوتی ہے اور عشق "عقلِ حقائق" سے کامراں ہوتا ہے۔

عقل از عشقِ حقائق استوار
عشق از عقلِ حقائق کامراں

شاعر کے نفسِ دراک نے "عشقِ حقائق" اور "عقلِ حقائق" کی اضافت میں عقل اور عشق کے درمیان ایتلاف کا وہ رشتہ دریافت کیا ہے جو اب تک نادریافتہ تھا۔

اب جو نظم میرے سامنے ہے، اس کا عنوان "کربلا" ہے۔ یہ نظم نہیں ہے، اکھڑے ہوئے سانس لیتا ہوا ایک خوں چکاں منظر یہ ہے۔ خیر و شر کے تصادم اور تضارب کے انجام کا ایک ناقابلِ برداشت ترین منظر یہ ـــــــ سفید ابر دبوڑھوں، پختہ عمر مردوں، بالا قامت جوانوں، لالہ فام نوجوانوں اور نورِ طلعت کم سنوں کے بسمل لاشوں کا خونا خوں منظر یہ۔

یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں کہی گئی ہے اور اس طور شروع ہوتی ہے۔

شمر با تیغِ برہنہ در قفا — کربلا درپیش مردانِ خدا
از شگافِ سر جبیں ہا لالہ گوں — تن ہمہ زخم و کفن ہا پُر ز خوں
ابنِ ملجم دست بر تیغِ جفا — مرتضیٰؑ غلطاں بہ خوں اندر دعا
عظمتِ حق را ہزاراں زیب و زین — زہر در کامِ حسنؑ قبل از حسینؑ
یک تن بے سر بہ دشتِ کربلا — یک سرِ بے تن بہ طشتِ اشقیا

کربلا تو ہر دور میں واقع ہوتی رہی ہے اور آج بھی واقع ہو رہی ہے۔ لیکن حسینؑ کی کربلا تاریخِ انسانی کی سب سے زیادہ شدید، شدید ترین کربلا تھی۔ "کربلا" کا شاعر اپنی تاریخ کے سوگوار سناٹوں کی اشک آلود لہروں پر تیرتی ہوئی کچھ دادیلا کناں صدائیں سنتا آیا ہے جو وقفے وقفے سے اس کے باطن میں نوحے اور مرثیے پڑھتی رہی ہیں۔ اس کے بابائے علّام کی اعتقادی تاریخ کے مطابق کربلا "کرۂ جاریہ" یعنی کرۂ ارض کی سب سے زیادہ حوادث انگیز سرزمین رہی ہے۔ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سیکڑوں بار یہ بات سُنی ہے کہ اسی سرزمین میں دانیالؑ نبی کو مطبق دزمین دوز قید خانہ) میں قید کیا گیا تھا۔ اسی سرزمین میں نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونکا تھا۔

بخت نصر یروشلم کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد سیکڑوں یہودیوں کو اسیر کر کے اسی

سرزمین میں لایا تھا اور ان پرمشقت اور اذیت کی جاں کاہ زندگی مسلط کی تھی۔ یرمیاہ نبی نے اسی سرزمین میں یروشلم کی تباہی کے مرثیے کہے تھے۔

اس نے اپنے بابا سے سامی اور آریائی صحیفوں کے حوالوں کے ساتھ بارہا یہ بات سنی ہے کہ کربلا ایک ازل الآزالی حقیقت اور ایک سرمدی معصوم ہے۔ اس نے ان سے کتاب یرمیاہ کے اصحاح ۴۶ کا یہ فقرہ کتنی ہی بار سنا ہے۔ "For the Lord God of the Host, There is a Sacrifice in the north Country by the river Euphrates." یعنی خداوند رب الافواج کے لیے شمالی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ایک ذبیحہ ہے۔

شاعر کو وہ مرثیہ جو امروہے میں آٹھویں محرم کو عزاخانہ شاہ مسکین ایرانی میں علم اٹھنے سے پہلے نسل ہا نسل سے پڑھا جاتا رہا ہے، لڑکپن سے بہت پسند تھا۔ اس مرثیے کا یہ عجیب اسطوری بند اس کی تخیل پسند طبیعت سے جتنی مناسبت رکھتا ہوگا اس کا بیان کرنا غیر ضروری ہے۔

اے برے لخت جگر ایسی جگہ ہے کربلا ۔ رنج اٹھاتے آئے ہیں جس جا پہ خاصان خدا
حضرت آدمؑ نے ٹھوکر کھائی خوں پاسے بہا ۔ آ گیا تھا واں تلاطم میں سفینہ نوحؑ کا
مورد آفات وہ جا اے مرے دل خواہ ہے ۔ اور خصوصاً وہ جگہ تیری تو وعدہ گاہ ہے

رئیس امروہوی کی مثنوی "کربلا" "وعدہ و وعدہ گاہ" کی جبریت کا ایک وجودیاتی کونیہ اور کونیاتی المیہ ہے۔ یہاں میں ایک جملہ رقم کرنا چاہتا ہوں (نہ جانے کیوں)، اور وہ یہ کہ یہ جو کچھ بھی ہے، وہ جبر میں اختیار ہے اور اختیار میں جبر۔

اب ہم "کربلا" کے منقولۂ بالا اشعار کی نسبت سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ہ شمر با تیغ برہنہ در قفا ۔ کربلا در پیش مردانِ خدا

یہ شعر ایک مکمل مرثیہ ہے۔ ایک المیے کا جامع ترین اجمال ہے۔ اس شعر کی کمال پہلوداری یہ ہے کہ اس میں "مردانِ خدا" کی ترکیب کو اس پیرایہ پردازی کے ساتھ استعمال کیا

گیا ہے کہ اس کی معنویت میں دو گونگی پیدا ہو گئی ہے۔ "مردانِ خدا" یعنی رفقائے حسینؑ "مردانِ خدا" یعنی شرفائے تاریخ۔ اور اس طرح شاعر کے اسلوب نے کربلا کو شرفائے تاریخ کا ایک عالمی ماتمیہ بنا دیا ہے اور جو ہے بھی۔

ان پانچوں شعروں کی ساختمان، در و بست اور تمثالوں کو دیکھیے! "دیکھیے" میں نے اس لیے کہا کہ ان شعروں کی صوریت میں جو کچھ بھی متمثّل ہوا ہے، وہ کسی واقعے کا 'بیان' نہیں ہے۔ ہم کسی حمید ابنِ مسلم اور عبداللہ ابنِ سمعان کے چشم دید واقعات سننے کے لیے نہیں بیٹھے، ہمیں تو انسانی تاریخ کے اس ناقابلِ قیاس وقوعے اور ایک شل کر دینے والی وجودیاتی موقعیت کو اس کے گرد و پیش کے ساتھ محسوس کرنا ہے۔

ان اشعار میں جو کچھ بھی ہے وہ کسی شاعرانہ اظہار کی ہنرمندی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ وہ تو ایک ایسا منظریہ ہے جس میں منظریت اور ناظریت کے درمیان کوئی دوئی نہیں پائی جاتی۔ بلکہ یہ کہا جانا چاہیے کہ بس بہ خودیٔ خودِ منظر ہی منظر ہے جس کا وسط اور گرد و پیش خون میں نہایا ہوا ہے۔ خون چاروں سمتوں سے ایک دوسرے کو ناشنیدہ آوازیں دے رہا ہے —— سزاواری ہے اور سزا ہے، شایستگی ہے اور شر ہے۔ خیر ہے اور خون ہے اور یہی اس منظر کا اذیت ناک ترین تمام تر ہے۔

ان اشعار کی ساختمان کا سب سے زیادہ شایانِ توجہ نوعیہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی شعر میں ایک بھی فعل استعمال نہیں ہوا۔ پانچوں شعر اسمیہ ہیں۔ میں اس پہلو کی اہمیت پر اصرار کرنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اسمیّت شعر یا مقولے میں 'کلیّت' پیدا کرنے کا ایک اہمیّت دار ترین کردار ادا کرتی ہے۔ یہ بات مفہومِ مفہوم کی شنوی جہت کے ساتھ صرف اور صرف شاعر یا حزنی تخلیق کار ہی سمجھ سکتا ہے

یہاں مجھے مشہ... ولایتی، شاعر متوطنِ ہندوستان شیخ علی حزیں کا جو ہمارے ماحول میں

گھونی، طربیے کی وہ سج دھج ہے جوایلیے نے اس سے عجب سہولت کے ساتھ چھین لی ہے۔ تن ہمہ زخم و کفن ہا پُرز خوں۔" موت ہے کہ بہ خودی خود رنگت کھیل رہی ہے اور تاریخ کی عظیم الشان تمثیل کی منظرآرائی میں محو ہے۔

'کربلا' کئی کربلاؤں کا خون چکاں جشن ہے۔" مرتضیٰؑ غلطاں بہ خوں ....."۔"زہر در کام حسنؑ قبل از حسینؑ"۔"کربلا زندگی افزا اور زندگی افروز" "زیب و زین" کی وہ پیش گاہ ہے، وہ پیش گاہ جس میں سارا اہتمام و انتظام تاریخ کے خیر طلب خون نے انجام دیا ہے۔

ے یک تنِ بے سر بہ دشتِ کربلا          یک سرِ بے تن بہ طشتِ اشقیا!

"یک تنِ بے سر...." اور "یک سرِ بے تن...." تمثال اور ساختمان کی نادر ترین مثال ہیں۔ ان دونوں ترکیبوں کی معجزانہ 'سہولت' ایک معجزہ ہے۔ پہلی نظر میں اس شعر سے بہ ظاہر ایک 'سرسری روانی' کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن دوسری نظر میں؛ دوسری نظر میں آپ ایک گہری کیفیت کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ کیا قاتل شعر ہے۔

اب "کربلا" دوسری ساختمان اختیار کرتی ہے، مرکب لسانی ساختمان یعنی اسمی اور فعلی ساختمان، یعنی اظہار کی وہ ساختمان جو انسانی معاشرے کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ساتھ نشوونمو کرتی رہی۔

اب شاعر احساس، تخیل اور اظہار کی ابداعی حرکیت میں سرگرم نظر آتا ہے۔

ے ذبحِ اسماعیلؑ را انجشد کریم          تا بہ گیرد فدیۂ ذبحِ عظیم
بوالبشر را از ارم بیرون کند          تا سرِ ہابیل را پُرخوں کند
چوں نہالِ لطف او بار آورد          صد مسیح تازہ بردار آورد
از لبِ منصور می راند سخن          قاتلِ منصور را گوید "بزن"
مقتلے آراست با صد زیب و زین          از لبِ سقراط تا حلقِ حسینؑ

میرے لڑکپن تک ایک ہتوانہ ہے o ہے ہے Te سمجھے جاتے تھے) ایک قصّہ یاد آیا۔ ایک دن شیخ علی کی خدمت میں فارسی کے ایک دیسی شاعر نے اپنی ایک غزل سنانی شروع کی اور مطلع عرض کیا، جو یہ تھا

سیہ چوری بدستِ آں نگارے نازنیں دیدم

بہ شاخ صندلیں پیچیدہ مارے عنبریں دیدم

مطلع سنتے ہی شیخ علی منغض ہو گئے اور قدرے خشونت آمیز لہجے میں لب کشا ہوئے "نازنیں دیدم" "عنبریں دیدم، یعنی چہ؟" پھر انھوں نے اس مطلع کو اس ترمیم بلکہ ترخیم کے ساتھ پڑھا:

سیہ چوری بدستِ آں نگارے
بہ شاخِ صندلیں پیچیدہ مارے

"نازنین دیدم" اور "عنبریں دیدم" کی ترخیم نے شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ اصل میں نازنین" اور "عنبریں" کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بات یہ ہے کہ دونوں "دیدم" اس شعر کا کھوجڑا کھو رہے تھے۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ میں نے اسمیت کے حق میں اور فعلیت کے خلاف کوئی فتوا صادر نہیں کیا ہے۔ یہ محض ایک پیشہ ورانہ نکتہ ہے، کوئی کلیہ ہرگز نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسمی ساختمان شعر، مقولوں اور مَثَلوں کی کلّیت کو فعلی ساختمان کے مقابلے میں زیادہ راس آتی ہے۔ یہاں شاید یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ قدیم انسان، قدیم ترین انسان نامکمل اسمیہ جملے بولتا

اب ہم کربلا کے منقولۂ بالا اشعار کی طرف واپس ہوتے ہیں۔ ان اشعار کی حرفیاتی اور لفظیاتی ہنرمندی اور احساس اور اظہار کی نغز پیوندی کا کم سے کم حق یہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں استغراقی توجہ سے کام لیں۔

"از شگافِ سر، جبیں ہا لالہ گوں" میں سرخ موت جس جمالیاتی طراز میں آراستہ ہو کر ماجرا پرداز ہوئی ہے، وہ طراز المیت کی انتہا ہے۔ المیے کی بے نہایتی یہ ہے کہ طربیہ اپنی تمام تر آراستگی اور پیراستگی کے ساتھ اس کے سامنے محض ایک ٹھٹول بن کے رہ جائے۔ لالہ

———— اس مرحلے پر ہم جس بنیادی مسئلے سے دوچار ہیں وہ جبر و اختیار کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ معلوم فکری تاریخ کے آغاز سے لے کر اس لمحے تک ایک بے حد لایعنی اور بے حد بامعنی مسئلہ رہا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جسے خدا اور ابلیس بھی حل نہیں کر سکے۔ ابلیس نے حلّاج کی زبان میں یہ کہا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا میں اس پر مامور تھا۔ یہاں مجھے مشرقی مفکّر زینو کا ایک قصہ یاد آیا۔ ظاہر ہے کہ ایک شریف آدمی اور ایک مفکّر کی حیثیت سے زینو غلامی کے سخت خلاف تھا۔ ایک دن وہ اپنے غلام کی کسی غلطی یا نافرمانی کی وجہ سے اسے مارنے پیٹنے لگا۔ غلام بھی زینو کا غلام تھا۔ سو اس نے کہا کہ ازل سے میرا مقسوم ہی یہ تھا کہ مجھ سے یہ غلطی سرزد ہو، زینو نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا کہ میں بھی ازل سے اس بات پر مجبور تھا کہ تجھے ماروں۔

شاعر کے نزدیک کربلا ایک کونیاتی اور وجودیاتی جبر یعنی لاادریت کو اس کونیاتی مصنف اور ہدایتکار کا نام نہیں معلوم جو کونیاتی پیش گاہ پر تاریخی تمثیلات پیش کر رہا ہے اور جس کے مسودے اور ہدایتکاری کے مطابق ایک منظر کے بعد دوسرا منظر "ناظرین" کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پردہ اُٹھ رہا ہے اور گر رہا ہے۔ سقراط ایتھنس کی ایک گلی کے نکڑ پر اشیاء کی ماہیت اور معنویت کے بارے میں سوال کر رہا ہے۔ اور پھر وہ ایک غار نما قید خانے میں شوکران کا پیالہ پی رہا ہے۔

———— اس نظم میں فکر، احساس، تخیّل، جذبے اور فن میں باہم کوئی غیریت نہیں پائی جاتی۔ اس لیے یہ نظم میرے خیال میں مطالعے کے اعتبار سے ایک مشکل ترین نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ———— تخلیقی استغراق کی حالت میں احساس اور جذبے کے ساتھ فن کے طور پر اور فن کے ساتھ احساس اور جذبے کے طور پر معاملت کی ہے جو ابداعی طور پر

نہایت درہم بستہ اور بہم پیوستہ معاملت ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اسکی وضعیت اور تمثالیت کیفیات کے اعتبار سے اور اس کی کیفیات وضعیت اور تمثالیت کے اعتبار سے اتنی بار دار ہیں کہ اس کے بارے میں کوئی بات کہنے سے بات نہیں بنتی۔ بس اس کی ترکیبوں کے ذریعے اس کے ساتھ تاثراتی معاملت کی جاسکتی ہے۔

"نہالِ لطف"، "صد صبح تازہ۔۔۔۔"۔ "مقتلے آراست باصد زیب و زین"۔ یہ ایک ایسی ساختمان ہے جس نے المیے اور طربیے کے فرق کو یکسر بے معنی کر ڈالا ہے۔ خون کی تمثیل ہے جو تاریخ کے حوادث کی سب سے زیادہ عظیم الشان پیش گاہ پر جاری ہے۔ حسینؑ اعظم کا خون قاتل بدی کی شکست کا جشن منا رہا ہے۔

اب جو شعر آرہا ہے اس کی ساختمان رسمی ہے۔

از پے طفلِ صغیر و نیم جاں          در کمیں خولی و ناوک در کماں

میرا مشورہ ہے کہ اس شعر کو بار بار پڑھا جائے۔ اس شعر کی ترکیب، بجد سادہ ترکیب "نیم جاں" کے ذریعے تین دن کے جاں کاہ ابتلا کو (بظاہر) کسی بھی اظہاری منصوبہ بندی کے بغیر ایک 'عاجلانہ' اور 'سہل انگارانہ' طور کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور یہ کہ بات بھی تمام نہیں کی۔ لیکن یہ طور اور بات کو ناتمام رکھنے کی بات کس قدر سفاکانہ ہے، کس قدر سفاکانہ! اس کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایک عجیب صورتحال ہے، 'ایک موجودیتی اختیار اور انتخاب' کی صورتِ حال۔ یہاں میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں جو اس کے برعکس ہے اور وہ یہ کہ یہ ایک ازلی آزمائش اور ابدی اذیت کی صورتِ حال ہے۔ اس ازلی آزمائش اور ابدی اذیت کے درمیان انسانی مقسوم کی تاریخ، یا جبروت تاریخ اپنا حوادث پر ور سفر طے کر رہی ہے۔

سید العرب والعجم کے نواسے ابو عبداللہ الحسینؑ ساکن مدینہ نے معلوم تاریخ میں پہلی بار ایک

مظلومانہ اور مقتولانہ جنگی حکمت عملی اختیار کی ہے۔ وہ اپنے شیر خوار بچے کو، دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ خیمے سے برآمد ہو رہے ہیں۔

درکمیں خولی و ناوک درکماں

کیا اس ارمی المصرع کی سکونی صورت اور ہیئت میں سکونی ہونے کے باوجود ایک نیم ارتعاش کی سی کیفیت محسوس نہیں ہوتی؟ "درکمیں" اور "درکماں" کی ساختمان، تماثلیت، ان کے آہنگ، ان کی حالت اور کیفیت کی تاثر انگیزی اور حادثہ آگینی کو ایک ماجرا جو انفعال کے ساتھ ملحوظ رکھیے۔ "ناوک درکماں" کی صورتِ حال کیا چند لمحات بعد کے مستقبل کی صورت گری نہیں کر رہی! میں نے دو تین سطر پہلے 'نیم ارتعاش' کی ترکیب استعمال کی ہے۔ یہاں میرے ذہن میں ایک یکسر غیر منطقی ارتسام وجود پزیر ہوا ہے اس ارتسام کو ایک بعید نامعقول ترکیب یعنی 'ساکن ارتعاش' سے تعبیر کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس ساکن ارتعاش میں چند لمحات کے بعد پیش آنے والے حادثے، ناقابل برداشت ترین حادثے کی سنگین ترین حرکیت کو جس حشر انگیزی کے ساتھ متمثّل کیا گیا ہے اُسے معرضِ ترسیل میں لانا میرے خیال میں قطعاً ممکن نہیں۔ بیان کا کوئی بھی بلیغ ترین طور و طراز اس مرحلے میں اپنا ادنیٰ سے ادنیٰ کردار بھی ادا نہیں کر سکتا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، شاعر نے المیتے کے سب سے شدید وقوعے کو نہایت سرسری طور سے پیش کیا ہے بلکہ اس نے تو وقوعے کو پیش ہی نہیں کیا۔ اس نے تو وقوعے کی 'تیاری' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہاں مجھے ایک مرثیے کا یہ بند یاد آ رہا ہے۔

ماں سے اصغرؑ وداع ہوتے ہیں — حرم اشکوں سے منہ کو دھوتے ہیں
بوسے لے لے کے شاہ روتے ہیں — دیکھنے والے جان کھوتے ہیں

رن کو جاتے ہیں ماں بلاتی ہے
ہاتھ پھیلائے ساتھ آتی ہے

حیران کن انسان حسینؑ اپنی آئی پر آیا ہوا ہے۔ وہ حسّاس تاریخ کے اعصاب کو شل کر دینا چاہتا

ہے۔ حمید ابن مسلم اتم اس ناقابلِ قیاس موقعیت (SITUATION) کو رقم کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے۔ یہ موقعیت تاریخ حوادث کی لامثال موقعیت ہے۔ مظلوموں اور مقتولوں کے خداوندگار حسینؑ نے تاریخ و تقویم کے بے شرم ترین ظلم اور بے حیا ترین استبداد پر تباہ کن ترین حملہ 'لہولہان حملہ' کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی انسان 'انسانی حالت' میں شاید ہی ایسا کوئی فیصلہ کرسکتا ہو۔ ایسا فیصلہ تو صرف خداوند خدا ہی کرسکتا ہے۔ کیا آج کے وقتِ عصر کے بعد بھی کوئی وقتِ عصر آئے گا؟

از پے طفلِ صغیر و نیم جاں
در کمیں خولی و ناوک در کماں[1]

---

(۱) میں نے اس نظم کو جس شعر پر ختم کیا ہے وہ اس سے آگے جاتی ہے۔ مگر میں کیا کروں کہ برادرِ عزیز قیصر زیدی نے مجھے تکمیل کار کی جو مہلت دی تھی اس کی میعاد کبھی کی گزر چکی ہے اور میں حالتِ سفر میں ہوں۔ مجھے بھائی کی اردو شاعری کے بارے میں خصوصی گفتگو کرنی تھی پر اب کیا کیا جائے۔

جون ایلیا ——— ۲۰۔ پالی ہل روڈ۔ باندرہ۔ بمبئی۔ ہندوستان

# غزلیات

تنگ ہیں ہم پر زمین و آسماں
چل کہیں اے دل! مگر اے دل کہاں؟
اس سفر میں ہم رکاب اپنے نہیں
آتش و ملیارہ و دُود و دُخاں
ہم فضائے روح میں ہیں پَر کُشا
اِس خلائی دور کے عادی کہاں؟
دمبدم چلتے رہیں تو خوب ہے
بوئے گل موجِ ہوا آبِ رواں
پائے بے جرّاب و دستِ بے جریب
ہم جریدہ ہیں سوئے منزل رواں!
بشنو از نے چوں حکایت می کند
و زجدائی ہا شکایت بر زباں
اے سکھی! جل جا برہ کی آگ میں
تا بیاید از تنِ تو بوئے جاں
گفت در جاہا کدامی خوشتر است
گفت آں جائے کہ باشد جانِ جاں
درمیان جان و جاناں شیوہ ہاست
شیوہ ہائے گفتگوئے جاں بجاں

مہجورِ ہر انجمن ہیں ہم لوگ!
اپنے ہیں جلا وطن ہیں ہم لوگ
جو سبزۂ و برگ سے ہو محروم
وہ شبنمِ بے کفن ہیں ہم لوگ
اے اپنی ہی خلوتوں میں محبوس
شاید تری انجمن ہیں ہم لوگ
خود اپنے وجود سے مقیّد
پابستۂ بے رسن ہیں ہم لوگ
اے عالمِ رنگ رنگِ تخلیق!
آزردۂ جان و تن ہیں ہم لوگ
ہر ذرّے میں سامعہ ہے بیدار
کس شخص سے ہم سخن ہیں ہم لوگ
ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ
خود اپنے شعورِ جاں سے ملبوس
بے پیکر و پیرہن ہیں ہم لوگ

دیارِ شاہدِ بلقیس ادا سے آیا ہوں
میں اِک فقیر ہوں شہرِ سبا سے آیا ہوں
جہانِ نو کی طلب ہے اور اِس خرابے میں
سوادِ اصطخر و نینوا سے آیا ہوں
شبِ سیاہِ خزاں کی سموم و صرصر تک
نگار خانۂ صبح و صبا سے آیا ہوں
ابھی کہاں ہے مجھے نوحہ و نوا کا شعور
کہ ایک ناحیۂ بے نوا سے آیا ہوں
مرے شعور کا عرفاں کسے نصیب کہ میں
سروشِ روحِ ازل ہوں سما سے آیا ہوں
دَمک رہی ہے زمان و مکاں کی پیشانی
ستارۂ ابدی ہوں خلا سے آیا ہوں
تمہارے غنچہ و گل سے غرض نہیں مجھ کو
اِدھر اشارۂ بادِ صبا سے آیا ہوں

جہاں معبود ٹھہرایا گیا ہوں
وہیں سولی پہ لٹکایا گیا ہوں
سُنا ہر بار میرا کلمۂ صدق
مگر ہر بار جُھٹلایا گیا ہوں
عجب اک سِرِّ مبُہم ہے مری ذات
نہ سمجھا ہوں نہ سمجھایا گیا ہوں
مرے نقشِ قدم نظروں سے اوجھل
مگر ہر موڑ پر پایا گیا ہوں
مثالِ وحیِ حق انسانیّت کے
ہر اک وقفے میں دُہرایا گیا ہوں
جو موسیٰ تھا تو ٹھکرایا گیا تھا
جو عیسیٰ ہوں تو جھٹلایا گیا ہوں
جہاں ہے رسم قتلِ انبیا کی
وہاں مبعوث فرمایا گیا ہوں
بطورِ فدیہ قرباں گاہ کی سمت
کہاں سے ہانک کر لایا گیا ہوں
ابھی تدفین باقی ہے ابھی تو
لہو سے اپنے نہلایا گیا ہوں

دوامی عظمتوں کے مقبرے میں
ہزاروں بار دفنایا گیا ہوں
میں اِس حیرت سرائے آب و گل میں
بحکمِ خاص بھجوایا گیا ہوں
کوئی مہمانِ ناخواندہ نہ سمجھے
بصد اصرار بلوایا گیا ہوں
بطورِ ارمغاں لایا گیا تھا
بطورِ ارمغاں لایا گیا ہوں
اسا میں ابتلا محکم ہے مجھ سے
کہ دیواروں میں چُنوایا گیا ہوں
کبھی تو نغمۂ داؤد بن کر!
سلیماں کے لیے گایا گیا ہوں
کبھی یعقوب کے نغمے میں ڈھل کر
درِ محبس پہ دہرایا گیا ہوں
ظہور و غیب و پیدا و نہاں کیا؟
کہیں کھویا کہیں پایا گیا ہوں
نہ جانے کون سے سانچے میں ڈھالیں
ابھی تو صرف پگھلایا گیا ہوں

خاموش زندگی جو بسر کر رہے ہیں ہم
گہرے سمندروں میں سفر کر رہے ہیں ہم
صدیوں تک اہتمامِ شبِ ہجر میں رہے
صدیوں سے انتظارِ سحر کر رہے ہیں ہم
ذرّے کے زخمِ دل پہ توجہ کیے بغیر
درمانِ دردِ شمس و قمر کر رہے ہیں ہم
ہر چند نازِ حُسن پہ غالب نہ آسکے
کچھ اور معرکے ہیں جو سَر کر رہے ہیں ہم
صُبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے ایک دن
یہ دن تڑپ تڑپ کے بسر کر رہے ہیں ہم
کوئی پکارتا ہے ہر اک حادثے کے ساتھ
تخلیقِ کائناتِ دگر کر رہے ہیں ہم!
اے عرصۂ طلب کے سُبک سیر قافلو!
ٹھہرو کہ نظمِ راہ گذر کر رہے ہیں ہم
تخمینۂ حوادثِ طوفاں کے ساتھ ساتھ
بطنِ صدف میں وزنِ گہُر کر رہے ہیں ہم
ہم اپنی زندگی تو بسر کر چکے رئیسؔ
یہ کس کی زیست ہے جو بسر کر رہے ہیں ہم

محبت ماورائے ہر تمنّا ہے جہاں میں ہوں
نہ عذرا ہے نہ لیلیٰ ہے نہ سلمیٰ ہے جہاں میں ہوں
مری منزل میں گنجائش کہاں خضرِ طریقت کی
فقط اِک اعتبارِ لغزشِ پا ہے جہاں میں ہوں
مشیّت سے متاعِ جذبۂ دل مانگنے والے!
مشیّت پر محبت حکم فرما ہے جہاں میں ہوں
کوئی یارب مرے ذوقِ نظر کی داد کیا دے گا
نگاہِ شوق توہینِ تماشا ہے جہاں میں ہوں
بھلا کیا غم مجھے ہنگامۂ تخریبِ حاضر کا
نئی تعمیر کا اک حشر برپا ہے جہاں میں ہوں
میں خود ڈوبا ہوا ہوں اپنے طوفانِ تخیّل میں
نہ موجیں ہیں نہ ساحل ہے نہ دریا ہے جہاں میں ہوں
ملامت گر! مجھے طعنے نہ دے طغیانِ مستی کے
کہ ساقی خود حریفِ بادہ پیما ہے جہاں میں ہوں
کرم کی التجا بھی کفر ہے میری نگاہوں میں
طلب کا ذوق بھی ننگِ تقاضا ہے جہاں میں ہوں
عطائے سلسبیل و جنّت و کوثر سے کیا حاصل؟
نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے جہاں میں ہوں

دلِ غمِ دو جہاں میں ڈوب گیا
بے کراں بے کراں میں ڈوب گیا

آسماں سے اُبھر کے نجمِ سحر
وسعتِ آسماں میں ڈوب گیا

قلزمِ بے کنارِ جلوہ و رنگ
دیدۂ خوں فشاں میں ڈوب گیا

اُف یہ ظلمت کہ ہر نشانِ افق
افقِ بے نشاں میں ڈوب گیا

ازلِ نا فنا پذیر آخر!
اَبدِ جاوداں میں ڈوب گیا

میں زماں تھا زماں میں غرق ہوا
میں مکاں تھا مکاں میں ڈوب گیا

جانِ جاناں! ترا سفینۂ حُسن!
میرے دریائے جاں میں ڈوب گیا

سیلِ عمرِ رواں کا ہر قطرہ
سیلِ عمرِ رواں میں ڈوب گیا

ہائے وہ معنیٔ لطیف کہ جو
قعرِ لفظ و بیاں میں ڈوب گیا

شریکِ کاروبارِ نفع و نقصاں ہم بھی ہوتے ہیں
جہاں کانٹے برستے ہیں گُل افشاں ہم بھی ہوتے ہیں
چراغاں دامنِ گردوں کو جب خورشید کرتا ہے
تو اے گردوں چراغِ زیرِ داماں ہم بھی ہوتے ہیں
غروبِ ماہ شاہد ہے کہ جب ایوانِ مشرق سے
طلوعِ مہر ہوتا ہے درخشاں ہم بھی ہوتے ہیں
نہیں کچھ توبۂ آدم ہی عظمت آدمیّت کی
خطائیں ہم بھی کرتے ہیں پشیماں ہم بھی ہوتے ہیں
عجب کیا ہے جو قدرت دنگ ہے آئینِ قدرت سے
کہ آئینہ بناتے ہیں تو حیراں ہم بھی ہوتے ہیں
ابد کے قلزمِ بے موج میں جنبش کہاں لیکن
جو رقّاصِ ازل ناچے تو رقصاں ہم بھی ہوتے ہیں
جہاں ہم پایۂ تقدیرِ یزداں دہر ہوتا ہے
وہاں ہم پایۂ تقدیرِ یزداں ہم بھی ہوتے ہیں
فقط یہ نظمِ دوراں ہی نہیں فرماں روا اپنا
کبھی فرماں روائے نظمِ دوراں ہم بھی ہوتے ہیں
جہاں منصوبۂ تخریبِ امکاں کارفرما ہو!
وہاں منصوبہ سازِ نظمِ امکاں ہم بھی ہوتے ہیں

رئیسؔ ! ہم جو سوئے کوچۂ حبیب چلے
ہمارے ساتھ ہزاروں بلا نصیب چلے
رفاقتوں کی سعادت لیے رفیق آئے
رقابتوں کی نحوست لیے رقیب چلے
جو قافلے کہ ہماری طلب میں نکلے تھے
کبھی بعید سے گذرے کبھی قریب چلے
عقب میں حادثۂ صبح و شام کے عفریت
جلو میں گردشِ ایام کے نقیب چلے
جہاں کو جن کے نصیبے پہ رشک آتا تھا
نکل کے اپنے گھروں سے وہ بدنصیب چلے
یہ چل چلاؤ کا عالم عجیب تھا اے دوست
غریب لوگ سوئے عالمِ عجیب چلے

جینا ہی نہیں کشمکشِ زیست کا مقصود
خوفِ اَجل و جہدِ بقا اور ہی کچھ ہے
کافورِ جنازہ میں ہے کچھ اور ہی خوشبو
بوئے کفنِ اہلِ وفا اور ہی کچھ ہے

پیرِ مغاں تھے صحبتِ اہلِ صنم میں ہم
ٹھہرے نمک حرام سوادِ حرم میں ہم

تیرِ ستم کی زد پہ سہی یہ خوشی تو ہے
کیا کیا چُبھے ہیں سینۂ اہلِ ستم میں ہم

وا حسرتا! قبیلۂ لیلےٰ سے چھوٹ کر
اعراب میں عجم ہیں عرب ہیں عجم میں ہم

دونوں ہیں اپنی ذات کی گہرائیوں میں غرق!
جس طرح تم میں تم ہو اُسی طرح ہم میں ہم

یہ وہم تھا کہ راہِ طلب ہے بہت طویل
پہونچے مگر کہاں سے کہاں دو قدم میں ہم

بے وسوسہ لُٹا کے متاعِ حیات کو
اب مبتلا ہیں وسوسۂ بیش و کم میں ہم

فقرِ غیور! تو ہی کرم کر کہ درج ہیں!
فہرستِ سائلانِ نگاہِ کرم میں ہم!

اب تک جو روح میں ہے بغاوت کا ولولہ
شاید شریکِ غدر تھے پہلے جنم میں ہم

کہہ دو رئیس کتبہ نویسانِ قبر سے
شامل نہیں تجارتِ اہلِ قلم میں ہم

من نگر جس کی جوت سے روشن!
اے سکھی! چاند؟ ناسکھی چندن
بدلیاں کس طرف ہیں آج رواں
گوپیوں کا ہے دیس بندرا بَن!
دیکھیے کس طرف نکل جائیں
لے کے ہم لوگ جوگیوں کا بَرن
بس اِسی آرزو میں جیتا ہوں
تو بجاں آئی چوں رَوم از تن
اے ہوائے شمال و بادِ جنوب
اُس پری زاد کا کہاں ہے وطن؟
کیا سمن زار ماوراء النہر؟
یا رِشی کیش و ہر دوار کے بن؟
اے سکھی! تیری آنکھ اور آنسو
ناسکھی! قطرہ ہائے گنگ وجمن

اپنی کوئل کو کوکتی ہے گھٹا
اپنے آہو کو ڈھونڈتا ہے ختن
اور گھٹا کی تلاش میں کوئل
اور ختن کے سراغ میں ہے ہرن
پھر اِدھر رخ ہوا ہواؤں کا
چھت پہ ہے کیوں ہجوم زاغ و زغن؟
میں تو خود ہی شکستہ خاطر ہوں
زلف بکشا ولے بہ رُخ مشکن!
اک تصور سہی مگر ہے تو
چاند کا روپ چاندنی کا بدن
نیمۂ عمر ما، بخواب گذشت
آ کے سپنوں ہی میں دکھا درشن
صبح چمکی، چمک اٹھا سورج
رات دمکی، دمک اٹھے ساجن

ہم کسی سے ملے مگر تا دیر
کوئی موضوعِ گفتگو نہ ملا

گرد میں اَٹ رہے ہیں احساسات
دھیمے دھیمے برس رہی ہے رات
جل اُٹھا اک چراغِ شام تو کیا
بجھ گئے بے شمار امکانات
ہائے ماضی کی دل نشیں یادیں
ہائے خونخوار بھیڑیوں کی برات
چیونٹیاں جیسے ذہن پر رینگیں
اُف یہ میرے لطیف احساسات
بھوت بن کر مجھے ڈراتی ھیں
میری نا آفریدہ تخلیقات
کون آیا مرے تعاقب میں ؟
وہی فکر و خیال کے جنّات !
کس نے پیچھے سے قہقہہ مارا
یہ اندھیرے میں کون ہے مرے سات

صرصرِ شب کہاں کہ پتّوں میں
فرطِ غم سے کراہتی ہے حیات
مجھ سے مجھ کو نہ چھین کر لے جائے
شاہزادیِ کشورِ ظلمات
صبح جاگا تو یاد بھی نہ رہا
رات تھی چاندنی کہ چاندنی رات
تودۂ ریگ و نخلِ خشکِ چنار
چھُپ گئی کس کی اوٹ میں برسات
یہ درختِ کہن لسانُ الغیب
اور یہ شاخِ خشک شاخِ نبات
کیا یہی ہے رئیسِ آشفتہ؟
اڑ کے آتے ہیں دور سے ذرّات

کوئی اُس حسنِ خواب آلود کے اَسرار کیا کھولے
ہوائے نیم شب نے آکے خود بندِ قبا کھولے!

یہ فقط شورشِ ہوا تو نہیں
کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں
بول اے اخترِ غنودۂ صبح
کوئی راتوں میں جاگتا تو نہیں
سُن کہ یہ مدّ و جزرِ موجۂ بحر
ماجراؤں کا ماجرا تو نہیں
ذہن پر ایک کھُردری سی لکیر
کھنکھجورے کا راستا تو نہیں
ریت پر چڑھ رہی ہے ریت کی تہ
بابل و مصر و نینوا تو نہیں
نوکِ ہر خار وخس ہے خوں آلود
روحِ صحرا برہنہ پا تو نہیں
تیرے جسمِ حسیں میں خوابیدہ
باغِ جنّت کا اژدہا تو نہیں
اے مری جانِ مبتلا ! کہ سکوں
تو کوئی جانِ مبتلا تو نہیں

سرچشمۂ زندگی رہا ہوں
اور زہرِ حیات پی رہا ہوں
کانٹوں سے فگار انگلیاں ہیں
ملبوسِ بہار سی رہا ہوں
ہر منزلِ جہل و معرفت میں
تصویرِ خود آگہی رہا ہوں
اللہ کے قرب کے علاوہ
ابلیس کے ساتھ بھی رہا ہوں!
میں قبلِ وجودِ بوالبشر بھی
سر تا بہ پا زندگی رہا ہوں
ہر عہد میں آدمی رہوں گا
ہر عہد میں آدمی رہا ہوں
کس طرح رہا ہوں کیا بتاؤں
کہنے کو ہنسی خوشی رہا ہوں

میں جو تنہا رہِ طلب میں چلا
میرا سایہ مرے عقب میں چلا
صبح کے قافلوں سے نبھ نہ سکی
میں اکیلا سوادِ شب میں چلا
جب گھنے جنگلوں کی صف آئی
ایک تارا مرے عقب میں چلا
آگے آگے کوئی بگولا سا!
عالمِ مستی و طرب میں چلا
میں کبھی عالمِ سکوں میں رُکا
اور کبھی شدّتِ غضب میں چلا
نہیں کُھلتا کہ کون شخص ہوں میں
اور کس شخص کی طلب میں چلا؟
ایک انجان ذات کی جانب!
الغرض میں بڑے تعَب میں چلا

عجب نہیں کہ نئے بو البشر کی ہو تخلیق
عطارد و مہ و مریخ و کہکشاں کے لیے

اے دل! شریک طائفہ وجد و حال ہو
پیارے! یہ عیب ہے تو بحدِّ کمال ہو
شبلی و بایزید و گرو نانک و کبیر
ہنگامۂ جلال میں رقصِ جمال ہو
سب کی زباں پہ مست قلندر ہو دم بدم
پھر اُس کے بعد رات میں ڈٹ کر دھمال ہو
پھر ہم سفر کریں طرفِ سمتِ لاجہت
نے شرق و غرب ہو نہ جنوب و شمال ہو
آساں رجوعِ شمس ہے لیکن ترے ملنگ
پہونچیں وہاں جہاں سے پلٹنا محال ہو
اک کائناتِ خواب بصد ممکناتِ خواب
نیرنگیٔ خیال بہ حُسنِ خیال ہو
سرشار و سربلند و سیہ مست و سرفروش
ماحول اپنے حال میں گم ہو وہ حال ہو
کیا کیا تصوّرات ہیں؟ کیا کیا تخیّلات؟
ایسا نہ ہو کہ یہ بھی طلسمِ خیال ہو
سب کچھ ہے گر طلسمِ خیال و فسوں تو پھر
اے دل! شریکِ طائفہ وجد و حال ہو

پیارے ! سب کچھ تیرے اندر بول دما دم مست قلندر
بول دما دم مست قلندر بول دما دم مست قلندر
ذرّہ صحرا پتّا جنگل دانہ کھیتی بجلی بادل
مانجھی ناؤ لہر سمندر بول دما دم مست قلندر
کیسا کھنڈر اور کیسی بستی ! نیستی کیا ! اور کیسی ہستی !
مرگھٹ مرقد مسجد مندر[1] بول دما دم مست قلندر
ہر مانجھی نے ہر نیّا نے جاکر یہ پیغام دیا ہے
ساحل ساحل بندر بندر، بول دما دم مست قلندر
کون و مکاں کے سنّاٹے میں ایک ہی نعرہ گونج رہا ہے
تیرے بھیتر میرے اندر بول دما دم مست قلندر
اونٹ الاؤ ریت اندھیرے اور ملنگوں کے یہ ڈیرے
بول دما دم مست قلندر بول دما دم مست قلندر

سرشکِ خوں سرِ مژگاں جو ہے دمِ سجدہ
نہ آستاں کے لیے ہے نہ آستیں کے لیے

---

[1] مندر کی دال مکسور ہے تو ہونے دیجئے۔ بول دما دم مست قلندر

یہ شہر شہرِ بلا بھی ہے کیبتہ ساز کے ساتھ
نکل چلو کسی محبوبِ دلنواز کے ساتھ
یہی نوائے عدم ہے یہی نوازشِ کُن !
خوشا حکایتِ نے حرفِ دلنواز کے ساتھ
سوئے نگار و سوئے شہرِ زر نگار چلیں
قلندرانِ ہوسناک و پاکباز کے ساتھ
سلام ہم نَفَسو ! الفراق ہم سَفرو !
سفر ہے دور کا وہ بھی رہِ دراز کے ساتھ
یہ خرقہ پوش فقیرانِ خارق العادات!
ہمارے قافلہ ہائے نیاز و ناز کے ساتھ
یہ جنگلوں کی مسافت یہ نغمۂ دف و چنگ
یہ وادیوں میں اِقامت سرود و ساز کے ساتھ
وہ وجد و حال کا عالم وہ رقصِ درویشاں
شہانِ ناز و گدایانِ بے نیاز کے ساتھ
خوشا وہ بانگِ اذاں وہ ترانۂ ناقوس
وہ بندگیٔ صنم بندۂ نماز کے ساتھ
ہر اک فقیر کے لب پر یہ نعرۂ مستاں!
چلے چلو اَدب و عجز و امتیاز کے ساتھ

مانا کہ تو سوار ہے اور میں پیادہ ہوں
مجھ سے حذر نہ کر کہ شناسائے جادہ ہوں
باطن میں سخت کافر و پُر پیچ و تہ بہ تہ
ظاہر میں ایک ہم سفرِ سہل و سادہ ہوں
اک شہرِ زر نگار ہے اقلیم شرق میں
اُس شہرِ زر نگار کا میں شاہزادہ ہوں
وا ہیں دریچہ ہائے خرد میری روح پر
کس نے کہا خرابِ خرابات و بادہ ہوں
اے خضر! قطبِ وقت کی تا چند جستجو؟
میرا مرید ہو کہ قویُ الارادہ ہوں!
میں ہمرہِ شمیم نہ اڑتا صبا کے ساتھ
افتاد تو یہی ہے کہ برگِ فتادہ ہوں
تیر افگنوں کی صف ہے اُدھر اور میں اِدھر
سینہ سپر رئیس، بہ قلبِ کشادہ ہوں

مقرّبین ہیں رمز آشنا کہاں نکلے
جو اجنبی تھے وہی اُن کے راز داں نکلے

حرم سے بھاگ کے پہونچے جو دیرِ راہب میں
تو اہلِ دیر ہمارے مزاج داں نکلے

بہت قریب سے دیکھا جو فوجِ اعدا کو
تو ہر قطار میں یارانِ مہرباں نکلے

قلندروں سے ملا مژدۂ سبک رُوحی
جو بزمِ ہوش سے نکلے تو سرگراں نکلے

قبیلۂ حرم و قومِ دیر و فرقۂ رند
ہمارے چاہنے والے کہاں کہاں نکلے

سکوتِ شب نے سکھایا ہمیں سلیقۂ نطق
جو ذاکرانِ سحر تھے وہ بے زباں نکلے

میانِ راہ کھڑے ہیں اِس انتظار میں ہم
کہ گردِ راہ ہٹے اور کارواں نکلے

گماں یہ تھا کہ پسِ کوہ بستیاں ہوں گی
وہاں گئے تو مزاراتِ بے نشاں نکلے !
گرے زمیں پہ جو ہفت آسماں سے ٹکرا کر
تو ہر قدم پہ یہاں اور ہفت خواں نکلے
اُفق سے پہلے تو دُھندلا سا اک غبار اُٹھا
پھر اس کے بعد ستاروں کے کارواں نکلے
کبھی کبھی تو ہر اک سانس پر ہوا محسوس!
کہ جیسے قالبِ آتش زدہ سے جاں نکلے
سمجھ رہا تھا زمانہ جنھیں نفوسِ جمال
وہ صرف چند نفس ہائے خونچکاں نکلے
کمالِ شوق سے چھیڑا تھا جن کو مطرب نے
وہ راگ ساز کے سینے سے نوحہ خواں نکلے
رئیس حجرۂ تاریکِ جاں کو کھول تو دوں
جو کوئی آفتِ قتّالۂ جہاں نکلے؟

تازگی یہ کہ بہاروں کا قصیدہ لب پر
تشنگی یہ کہ زباں پر ہیں نمایاں کانٹے

اہرمن ہے نہ خدا ہے مرا دل
حجرۂ ہفت بلا ہے مرا دل
مہبطِ روحِ ازل میرا دماغ
اور آسیب زدہ ہے مرا دل
سر جھکا کر مرے سینے سے سنو
کتنی صدیوں کی صدا ہے مرا دل
اجنبی زاد ہوں اِس شہر میں میں
اجنبی مجھ سے سوا ہے مرا دل
آؤ قصدِ سفرِ نجد کریں
راہ ہے راہ نما ہے مرا دل
چند بے نام و نشاں قبروں کا
میں عزادار ہوں یا ہے مرا دل
نہ تقاضا ہے کسی سے نہ طلب
مدّعا ہے نہ دعا ہے مرا دل
راکھ بن بن کے اُڑی ہے مری روح
خون ہو ہو کے بہا ہے مرا دل
پہلے میں دل سے خفا رہتا تھا
اور اب مجھ سے خفا ہے مرا دل

ناوک ہے سو فرسودہ صیاد سو افسردہ!
تو کس سے گریزاں ہے اے آہوئے رم خوردہ
اے ساقیِ لب تشنہ! تلخابۂ ہجراں سے
بہتر ہے کہیں زہرِ انگور کا افشردہ
حد بھی ہے کوئی آخر اِس کرب و کشاکش کی
ہنستا ہے غمِ زندہ روتا ہے دلِ مردہ
ہم نعمتِ ماضی سے محروم نہ کیوں رہتے؟
ہم کو تو نگلنا تھا تاریخ کا پس خوردہ
اے دیر و حرم والو! ہم ہجر نصیبوں سے
اللہ بھی آزردہ اصنام بھی آزردہ!
پردیس میں کیا کہیے ہم لوگ کہاں کے ہیں
اک قریۂ خوباں تھا سیلابِ بلا بُردہ

سفر میں کوئی رکاوٹ نہیں گدا کے لیے
کھلا ہوا ہے ہر اک راستہ ہوا کے لیے

یہ پوچھتی ہے ہر اک صبح آکے موجِ نسیم
کوئی پیام کسی یارِ آشنا کے لیے

طوافِ دیر و حرم سے تو ہو چکے فارغ
چلو زیارتِ یارانِ باصفا کے لیے

میں کیوں نہ با سرِ عریاں پھروں تہِ افلاک
کہ فخر ہے سرِ عریاں برہنہ پا کے لیے

یہ شہر شہرِ بخیلاں ہے اے دلِ بیمار
یہاں تو زہر بھی ملتا نہیں دوا کے لیے

شکار ڈھونڈھ کے لائی کہاں کہاں سے حیات
درندۂ اجل و اژدرِ قضا کے لیے

سوائے کشتی لنگر گسستہ کیا ہوگی!
غریقِ بحر کی سوغات ناخدا کے لیے

ہمیں ہیں کیوں ہدفِ طنز اے عروسِ بہار!
سبھی نے پھول چنے تھے تری قبا کے لیے

جہاں جہاں بھی ہوئے پر کشا ہم اہلِ زمیں
زمیں کا بوجھ ہی ثابت ہوئے خلا کے لیے

بلند و پست میں منزل ہمیں کہیں نہ ملی
جو آسمان سے نازل ہوئے، زمیں نہ ملی
گِلہ نہیں کہ ترا سنگِ آستاں نہ ملا
یہ ہے کہ دیدۂ تر کو وہ آستیں نہ ملی
کبھی جو شانۂ عقدہ کُشا نصیب ہوا
تو اُسکی زلف گرہ گیر و عنبریں نہ ملی
بجا کہ جانِ زلیخا تھے مصر میں یوسف
مگر جو بات تھی کنعاں میں وہ کہیں نہ ملی
ملے جو عرش پہ خلد بریں تو کیا حاصل
کہ اِس زمیں پہ ہمیں جنّتِ زمیں نہ ملی
رئیسؔ! داد خداوندِ آفرینش کو
اگر ملی تو بجز حرفِ آفریں نہ ملی

تم لوگ سنا کرتے ہو فریادِ جرس کو
ہم عالمِ فریادِ جرس دیکھ رہے ہیں!
اِس سال ہیں کچھ اور ہی قسمت کے اشارے
کچھ رنگ نیا اب کی برس دیکھ رہے ہیں

اب مجھے دشمن سے بھی آنے لگی خوشبوئے دوست
اِس قدر آوارگی اے نکہتِ گیسوئے دوست!
گر کمیں گاہوں میں رہزن ہیں تو ہوں پروا نہیں
ہم ہیں زندہ اور سلامت باکرامت کوئے دوست
ہم فقیروں کے لیے یکساں ہیں دونوں حادثے
گردشِ رفتارِ دوراں جنبشِ ابروئے دوست
دیکھیے کیسے نبھے، کب تک نبھے! کیوں کر نبھے!
ہم قلندر پیشہ اور حفظِ مراتب خوئے دوست
روح پر جو خود بخود طاری ہے کیفِ شرحِ صدر
عین ممکن ہے کہ پہونچے مژدۂ دل جوئے دوست
طوفِ کعبہ میں کیا شیخِ حرم سے جب سوال
کس طرف سجدہ کروں؟ آواز آئی سوئے دوست

نہ صبح و شام کہیں ہیں نہ چاند تارے ہیں
سب ایک شاعرِ فطرت کے استعارے ہیں
ہمیں تو ہیں کہ جنھوں نے شبِ جدائی میں
ترے وصال کے اے دوست دن گزارے ہیں

کوے جاناں! مجھ سے ہرگز اتنی بیگانہ نہ ہو
عین ممکن ہے کہ پھر تیری طرف آنا نہ ہو
عین ممکن ہے کہ دہراؤں حدیثِ دیگراں
آج جو میری زباں پر ہے وہ افسانہ نہ ہو
عین ممکن ہے کہ جا پہونچوں کسی مرّیخ پر
اِس زمیں سے کوئی رشتہ کوئی یارانہ نہ ہو
پیرِ مے خانہ! یہ ممکن ہے کہ میرا جانشیں
رند ہو۔ پر واقفِ آدابِ مے خانہ نہ ہو
تو مجھے فرزانگی کا فن نہ سِکھلا اے خِرد!
عین ممکن ہے کہ مجھ سا کوئی دیوانہ نہ ہو
عین ممکن ہے کہ میں تجھ سے بچھڑ جانے کے بعد
ایسا بن جاؤں کہ خود تیری جسے پروا نہ ہو
سوچ مت ایدوست! تیرے بعد کیا ہوگا؟ یہ سوچ
یعنی میرے بعد پھر مجھ سا کوئی پیدا نہ ہو
پھر نہ اُٹھے کوئی عارف میری وضعِ خاص کا
اور مجھ سا شاعرِ سرشار و ہوش افزا نہ ہو
یعنی میرے بعد کوئی مردِ حکمت آفریں
منظرِ حکمت پہ آئے اور فرزانہ نہ ہو

پہلے تو بے دریغ مرا سر قلم کرو
پھر سرگذشتِ خونِ شہیداں رقم کرو
باطل بہ مصلحت ہو اگر حق کا مدّعی
تردید اُس کے حق کی خدا کی قسم کرو
اعدادِ سنگِ میل ہیں گُم راہ گُن بہت
یارو! قدم قدم پہ شمارِ قدم کرو
جنگل سے آندھیوں کے گزرتے ہیں قافلے
شاخوں کو حکم ہے سرِ تسلیم خم کرو
ہاں! مجھ کو کربِ ذات نے مجنوں بنادیا
مجنوں ہوں میں تو سورۂ جن مجھ پہ دم کرو
جن سے مخاصمت ہو انھیں سے منافقت!
کُھل کر ستم کی مشق ہو اتنا کرم کرو
کل تھا سروشِ غیب سے اپنا مکالمہ
اُس نے کہا کہ فکر کو تیغِ دُو دَم کرو
میں نے کہا کہ مجھ کو بکھرنے کا خوف ہے
اُس نے کہا کہ روح کے اجزا بہم کرو

میں نے کہا کہ ہجر کا غم ہے بہت شدید
اُس نے کہا کہ وصل سے درمانِ غم کرو
میں نے کہا کہ کشتِ تمنّا پڑی ہے خشک
اُس نے کہا کہ گریۂ خونیں سے نم کرو
میں نے کہا کہ قصۂ غم ہے بہت طویل
اُس نے کہا مبالغۂ شعر کم کرو
پوچھا کہ رازِ جاں کو سپردِ قلم کروں
اس نے کہا ضرور سپردِ قلم کرو
میں نے کہا کہ ضبطِ نگارش کا خوف ہے
اُس نے کہا کہ صفحۂ جاں پر رقم کرو
میں نے کہا کہ مجھ پہ جوارِ حرم ہے تنگ
اس نے کہا کہ قصدِ دیارِ صنم کرو

❖

حُسنِ شفق و رنگِ حنا اور ہی کچھ ہے
اور سرخیِ خونِ شہدا اور ہی کچھ ہے
اِس سال نہیں بیمِ خزاں لشکرِ گل کو
اس سال گلستاں کی ہوا اور ہی کچھ ہے

تم اے رئیس! اب نہ اگر اور مگر کرو
کچھ دیر اپنے ساتھ بھی پیارے! بسر کرو
ممکن ہے ذات کا اسی لمحے میں ہو ظہور
اک لمحہ کائنات سے قطعِ نظر کرو
طیّارہ ہائے عہدِ رواں ہیں صدا شگاف
مثلِ شعاعِ نور خلاء میں سفر کرو
کب تک معاملہ یہ دماغوں سے شہد کا
تاثیرِ زہر بن کے دلوں میں گذر کرو
کب تک خود اپنے دل میں چبھوؤ گے برچھیاں
نوکِ سناں سے گنبدِ بے در میں در کرو

○

اماں مشکل نظر آئی جو ہرنوں کی قطاروں میں
غزالِ تیر خوردہ جا چھپا شیروں کے غاروں میں
عجب کیا ہے! کسی پتھر میں شنوائی اُبھر آئے
صدائے گم شدہ ہوں گھومتا ہوں کوہساروں میں
دغا دی ہے جو ہم نے اپنے یارانِ گذشتہ کو
سُنا یہ ہے کہ ماتم آج تک اُسکا ہے یاروں میں

کیسی نجات مل نہ سکے گی پناہ تک
اب تیر آرہے ہیں مری خیمہ گاہ تک
کیا تذکرہ سپاہِ شہادت نصیب کا
غلطاں بخوں ہے پرچمِ میرِ سپاہ تک
اے قوم! ترکِ تازیِ تازہ کا دم کہاں؟
مسدود ہے فرار و ہزیمت کی راہ تک
ڈرتا ہوں برشگالِ حوادث نہ ہو کہیں
اک ابرِ خوں محیط ہے حدِّ نگاہ تک
یہ راہِ شوق تیری رفاقت میں کٹ گئی
اے دوست! اور چند قدم قتل گاہ تک
بھاگو کہ ایک سیلِ بلا ہے رواں دواں
قومِ تباہ حال سے شہرِ تباہ تک
حیرت یہ ہے کہ روشنیِ صبح کس طرح؟
پہونچی ہے شام سے مرے روزِ سیاہ تک
اب کون ارتکابِ گناہِ وفا کرے
باقی نہیں ہے جرأتِ عرضِ گناہ تک

غروبِ مہر کا ماتم ہے گلستانوں میں
نسیمِ صبح بھی شامل ہے نوحہ خوانوں میں
جہاں تھے رقصِ طرب میں کبھی درو دیوار
بلائیں ناچ رہی ہیں اب ان مکانوں میں
اندھیری رات بھیانک کھنڈر مہیب فضا
بھٹک رہا ہوں اجل کے سیاہ خانوں میں
یہ آمد آمدِ طوفانِ شب خدا کی پناہ
طیورِ شام دبک جائیں آشیانوں میں
یہ سائیں سائیں کی آواز ہے کہ موت کی ہوک؟
جو گونجتی ہے شیاطین کے ترانوں میں
ندیمِ شب! کوئی افسانہ، فسون وطلسم
کہ زندگی کی جھلک ہے انھیں فسانوں میں
نہیں ہے شہرِ وفا کی تباہیوں کا گلہ
مگر وہ لوگ جو رہتے تھے ان مکانوں میں؟
عجیب تھیں یہ غریبوں کی بستیاں لیکن
غریب رہ نہ سکے اِن غریب خانوں میں
ہماری گردِ سفر بھی نہ اب ملے شاید
رئیسؔ اہلِ تمنّا کے کاروانوں میں

رئیسؔ اشکوں سے دامن کو بھگو لیتے تو اچھا تھا
حضورِ دوست کچھ گستاخ ہو لیتے تو اچھا تھا
جدائی میں یہ شرطِ ضبطِ غم تو مار ڈالے گی
ہم ان کے سامنے کچھ دیر رو لیتے تو اچھا تھا
بہاروں سے نہیں جن کو توقع غنچہ و گل کی
وہ اپنے واسطے کانٹے ہی بو لیتے تو اچھا تھا
ابھی تو نصفِ شب ہے انتظارِ صبح تو کیسا؟
دلِ بیدار! ہم کچھ دیر سو لیتے تو اچھا تھا
فقط اک گریۂ شبنم کفایت کر نہیں سکتا
چمن والے کبھی جی بھر کے رو لیتے تو اچھا تھا
سُراغِ کارواں تک کھو گیا اب سوچتے یہ ہیں
کہ گردِ کارواں کے ساتھ ہو لیتے تو اچھا تھا
قلم رُودادِ خون و اشک لکھنے سے جھجکتا ہے
قلم کو اشک و خوں ہی میں ڈبو لیتے تو اچھا تھا

خدا جانے یہ کس نے لکھ دیا ہے بابِ زنداں پر
یہاں تو صرف وہ جیتے ہیں جو مر کر نکلتے ہیں

کہیں سے سازِ شکستہ کی پھر صدا آئی
بہت دنوں میں اِک آواز آشنا آئی
چلی کچھ آج اِس انداز سے نسیمِ سحر
کہ بار بار کسی کی صدائے پا آئی
تمہاری طلعتِ زیبا کو کرلیا سجدہ
نظر جہاں بھی کوئی شکلِ دلربا آئی
عجیب لطف ہوا اُن کی یاد سے محسوس
کہ جیسے دل کے دریچے کھُلے ہوا آئی
رہِ حیات میں کانٹے بکھیرنے والے
حیات بھی ترے در تک برہنہ پا آئی
چمن سے پہلے تو اک سیلِ آتشیں گزرا
پھر اُس کے بعد برستی ہوئی گھٹا آئی
شروعِ عشق میں ان سے ہی کچھ حجاب نہ تھا
کبھی کبھی تو خود اپنے سے بھی حیا آئی
ہم اپنے حالِ پریشاں پہ بارہا روئے
اور اُس کے بعد ہنسی ہم کو بارہا آئی
کبھی قریب سے چھیڑا جو سازِ جاں کو نئیں
تو گوشِ دل میں بہت دُور کی صدا آئی

حبس کے عالم میں محبس کی فضا بھی کم نہیں
روزنِ دیوارِ زنداں کی ہوا بھی کم نہیں
شورشِ زنجیرِ پا پر ہیں اگر پابندیاں
ہلکے ہلکے جنبشِ زنجیرِ پا بھی کم نہیں
گر سرِ مقتل نہ ہو ذکرِ بتاں کا حوصلہ
حجرۂ تاریک میں یادِ خدا بھی کم نہیں
رہروِ شب! کیوں چراغِ مہ سے دریوزہ گری ؟
رات اندھیری ہو تو جگنو کی ضیا بھی کم نہیں
لاکھ محکم ہو حصارِ مرحبی و عنتری
غازیوں کا بازوئے خیبر کشا بھی کم نہیں
عہدِ گل سے سازشِ بادِ خزاں بھی کم نہ تھی
شاخِ گل سے سوزشِ برقِ بلا بھی کم نہیں
کیا ہوا گر واعظ و ملّا کے دل ہیں بے چراغ
حجرۂ مسجد میں ننھا سا دِیا بھی کم نہیں
لذّتِ بادہ ہے جاں پرور مگر اے اہلِ ذوق
زہرِ اشک و قطرۂ خوں کا مزہ بھی کم نہیں

طوفاں سے مفر ہے نہ زمیں پر نہ فضا میں!
چل بیٹھیے خود رہ گذرِ سیلِ بلا میں
دم کیوں نہ گھُٹے شہر و بیاباں کی فضا میں
جلتے ہوئے شہروں کی عفونت ہے ہوا میں
یہ برہنہ پا کون رہِ شوق سے گزرا
کیوں خون کے دھبّے ہیں نشانِ کفِ پا میں؟
اس رات مہ و کاہ کشاں کا ہے یہ عالم
جیسے کوئی زنجیر معلّق ہو خلا میں
منشورِ ہلاکت ہی سہی نوعِ بشر کا!
لکھّا تو ہو کچھ دفترِ دیوانِ قضا میں
تخریبِ دو عالم کا سبب بن کے رہے گی
وہ جنگ کہ جاری ہے بشر اور خدا میں
شبنم پہ ہے کیوں ریزۂ الماس کا دھوکا؟
کیوں زہر کی بُو ہے نفَسِ بادِ صبا میں؟
انسان ہے یوں مرحلۂ شوق کا راہی
جس طرح بگولے کا سفر دشتِ بلا میں
رہزن ہیں چپ و راست جلو میں ہیں حوادث
اور لشکرِ ارواحِ خبیثہ ہے قفا میں!

شکوہ کرنے سے کوئی شخص خفا ہوتا ہے
اور شکوہ نہیں کرتے تو گِلہ ہوتا ہے
حشر جس سے دلِ مضطرب میں بپا ہوتا ہے
وہ کوئی نغمۂ بے صوت و صدا ہوتا ہے
روحِ شاعر سے ابھرتا ہے سرودِ ابدی
عین اُس وقت کہ دل ڈوب رہا ہوتا ہے
گام زن روح ہوئی وادیٔ خاموشاں میں
ختم آخر سفرِ کوہِ ندا ہوتا ہے

○

ہم نے اے دوست! رفاقت سے بھلا کیا پایا
جوئے بے آب ہے تُو میں شجرِ بے سایہ
وردِ جو عقل کے اسراف سے بچ رہتا ہے
عشق کے قحط زدوں کا ہے وہی سرمایہ
دیدہ و دل سے گذرتا ہے کوئی شخص اکثر
جیسے آہوئے رمیدہ کا گریزاں سایہ

کل فقط گیسوئے برہم تھے نشانِ تشویش
آج دیکھا تو انھیں اور پریشاں پایا
حسن سے جب بھی چھڑا معرکۂ دیدہ و دل
خود مرا عشق مرے مدِّ مقابل آیا
میں ہوں خود اپنی ہی خاکسترِ جاں میں مدفون
دفن ہو جیسے خرابے میں کوئی سرمایہ

○

اِس بحر میں کتنی کشتیوں کو!
ساحل کی ہوا ڈبو گئی ہے
گُل جن کی ہنسی اڑا چکے تھے
شبنم بھی انھیں کو رو گئی ہے
کل سے وہ اداس ہیں کچھ
شاید کوئی بات ہو گئی ہے!
شاداب ہے جن سے کشتِ ہستی
وہ بیج بھی موت بو گئی ہے
پہلے بھی خراب تھی یہ دنیا
اب اور خراب ہو گئی ہے

بہار اک دن کی گُل اک دم کا مہماں ہے، مگر کیوں ہے؟
ہمیشہ سے یہی نظمِ گلستاں ہے، مگر کیوں ہے؟
فروغِ آئنہ آئینِ فطرت تھا، مگر کیوں تھا؟
شکستِ آئنہ تقدیرِ یزداں ہے، مگر کیوں ہے؟
وہی شعلہ کہ جس نے پھونک ڈالا خانۂ جاں کو
وہی شعلہ فروغِ خانۂ جاں ہے، مگر کیوں ہے؟
مقدّر تھا کہ اسرارِ دو عالم فاش ہو جائیں
بشر اپنی جسارت سے پریشاں ہے، مگر کیوں ہے؟
نوا پیرائے ہستی! کاش اتنا ہی بتا دیتا
نوا کا مقبرہ شہرِ خموشاں ہے، مگر کیوں ہے؟

باوصفِ خود پسندی یہ کربِ دردمندی؟
بیگانگی کے دعوے اور اس قدر یگانہ!
اللہ رے تیری عظمت اے کافرِ محبّت!
اُف رے ترا زمانہ اے حاصلِ زمانہ!

ہجر سے وصل اِس قدر بھاری ؟
شام سے دل پہ ہول ہے طاری
اپنی افتادِ طبع کیا کہیے !
وہی دیرینہ دل کی بیماری
اُن کے چہرے پہ فتح کے باوصف
اِنفعالِ شکست ہے طاری!
دل کئی روز سے دھڑکتا ہے
ہے کسی حادثے کی تیاری
اُن کو تکلیفِ ناز دیتا ہوں
ہائے یہ خُوئے دوست آزاری
بعض اوقات عزمِ ترکِ وفا
عین مِن جملۂ وفاداری
جان لیوا سہی جراحتِ عشق!
عقل کا زخم ہے بہت کاری
کاش مجھ کو حِصار میں لے لے
میرے گھر کی چہار دیواری!

زندگی میں کہ ہمہ معرکہ آرائی ہے
کس قدر نظم ہے ترتیب ہے رعنائی ہے
خلوتیں ماہ وستارہ کی سجانے والے
ہائے کیا چیز ترا عالمِ تنہائی ہے
غیرتِ حسن کہاں کشمکشِ دید کہاں ؟
آئینہ اپنے تحیر کا تماشائی ہے
سج گئی قامتِ جاناں پہ قبائے ہر رنگ
جامہ زیبی بھی عجب جامۂ زیبائی ہے
ہم ابھی خواب میں ہیں اور یہ احساسِ وجود
جس سے کچھ نیند اُچٹ جائے وہ انگڑائی ہے

گِلہ نہ کر جو گلے لگ کے پیار کرتا ہوں!
ترے بدن کا یہی اقتضا ہے کیا کیجے

رازِ گرفتگی نہ اسیرِ چمن سے پوچھ
یہ بات اپنی زلفِ شکن در شکن سے پوچھ
آوارگی کے لطف نہ سرو و سمن سے پوچھ
وحشت میں کیا مزہ ہے ہوائے چمن سے پوچھ
صحنِ چمن میں لالہ و گل پر ترے بغیر
کیا کیا گذر رہی ہے بہارِ چمن سے پوچھ
اے فصلِ گل! مزاجِ جراحت رسیدگاں
گر ہو سکے تو لالۂ خونیں کفن سے پوچھ
افسانۂ بہار اسیرِ قفس سے سُن
یادِ وطن کا لطف کسی بے وطن سے پوچھ
اے دوست! ہم سے کفرِ محبّت کا درس لے
اسرارِ کافری نہ بُت و برہمن سے پوچھ
آغازِ ارتباط و تعلّق کے واقعات
کچھ اپنے ہوش کچھ مرے دیوانہ پن سے پوچھ
کیا شامِ غم میں دیدہ و دل پر گذر گئی
اِن تازہ واردانِ بساطِ کہن سے پوچھ
ہم بھی کبھی تھے یوسفِ کنعانِ رنگ و بُو
پیرِ ضعیف و پیرزن و پیرہن سے پوچھ

صُبحِ نو! ہم تو ترے ساتھ درخشاں ہوں گے
اور ہوں گے جو ہلاکِ غمِ ہجراں ہوں گے
صدمۂ ہجر کے شکوے نہ کرا اے جانِ رئیسؔ
بخدا یہ نہ ترے درد کا درماں ہوں گے
میری وحشت میں ابھی اور ترقی ہوگی
تیرے گیسو تو ابھی اور پریشاں ہوں گے
آزمائے گا ابھی اور ہمیں وقت کا جبر
ہم ابھی اور اسیرِ غمِ دوراں ہوں گے
عاشقی اور مراحل سے ابھی گذرے گی
امتحاں اور محبّت کے مری جاں ہوں گے
قلبِ پاکیزہ و ادراکِ منوّر دے کر
آئنہ ہم کو بنایا ہے تو حیراں ہوں گے
شاخِ افسردۂ اُمید کو پامال نہ کر
کہ نئے پھول اِسی شاخ پہ خنداں ہوں گے
صدمۂ تیرگیٔ شب سے گلہ سنج نہ ہو
کہ نئے چاند اِسی شب سے فروزاں ہوں گے
آج ہے جبر و تشدّد کی حکومت ہم پر
کل ہمیں بیخ کنِ قیصر و خاقاں ہوں گے

وہ کہ اوہام وخرافات کے ہیں صیدِ زبوں
آخر اِس دامِ غلامی سے گریزاں ہوں گے
ایک ہی سیلِ حوادث تو نہیں قسمت میں
کچھ ابھی اور بھی طوفاں پسِ طوفاں ہوں گے
خواب ہو جائے گا یہ عالمِ اندوہِ فراق
حسرتِ وصل نہیں وصل کے ساماں ہوں گے
صرف تاریخ کی رفتار بدل جائے گی
نئی تاریخ کے وارث یہی انساں ہوں گے

کیوں یہ بیگانہ روی اے نفسِ بادِ سحر
کب سے اک شمع بھڑکتی ہے سرِ راہ گذر
قہر یہ ہے کہ نہیں حکمِ اقامت دم بھر
لطف یہ ہے کہ نہ منزل نہ کوئی سمتِ سفر
جب بھی اسبابِ پریشانیِ خاطر سوچے
جا کے ٹھہری ترے گیسوئے پریشاں پہ نظر

شوقِ فریاد کی تکمیل مبارک اے دل
نہ ہوا کوئی بھی فریاد رسِ شوق اگر؟
میری پلکیں تو جدائی میں کبھی نم نہ ہوئیں
کون روتا ہے الٰہی! مرے دل میں چھپ کر
دیدہ و دل کی نگہداشت بہت کی ہم نے
ٹوٹ جانا ہی ان آئینوں کی قسمت ہو اگر
کاش وہ دن ہو کہ میں جانبِ در تکتا ہوں!
اور وہ خانۂ جاں سے یہ پکارے کہ ادھر
رہروِ زیست ہے صحرائے بلا کا سیّاح
سفرِ شوق ہے انجان جزیروں کا سفر
زلزلے تاک لگائے ہیں کمیں گاہوں میں
حادثے زیرِ قدم تیز ہیں آہستہ گذر
دلِ خوں گشتہ و لب ہائے تبسم آلود
اُف یہ پابندیِ آئینِ بہار اے گلِ تر!
آنکھ تو کھول خمارِ شبِ فرقت سے رئیسؔ
دیکھ تو کون یہ بیٹھا ہے تری بالیں پر

دل سے یا گلستاں سے آتی ہے!
تیری خوشبو کہاں سے آتی ہے
کتنی مغرور ہے نسیمِ سحر
شاید اُس آستاں سے آتی ہے
خود وہی میرِ کارواں تو نہیں
بوئے گُل کارواں سے آتی ہے
اُن کے قاصد کا منتظر ہوں میں
اے اجل! تو کہاں سے آتی ہے
ہو چکیں آزمائشیں اتنی!
شرم اب امتحاں سے آتی ہے
عین دیوانگی میں یاد آیا!
عقل عشقِ بتاں سے آتی ہے
تیری آواز گاہ گاہ اے دوست
پردۂ سازِ جاں سے آتی ہے
شکوہ کیسا کہ ہر بلا اے دوست
جانتا ہوں جہاں سے آتی ہے
دل سے مت سرسری گذر کہ زہیں
یہ زمیں آسماں سے آتی ہے

مشامِ جاں معطّر جس کی بوئے پیرہن سے ہے
نہیں معلوم اُس یوسف کو نسبت کس وطن سے ہے
قبائے رنگ و بُو کی دلفریبی دیکھنے والو !
یہ سب خوبی عروسِ گل کی ترکیبِ بدن سے ہے
بہاریں ڈھونڈتی ہیں گلستاں در گلستاں جس کو !
الٰہی ! وہ گُلِ شاداب آخر کس چمن سے ہے
نہ چھیڑ آشفتگانِ شوق کو یہ بھی تو سوچ آخر
نہ جانے کون کس عالم میں کس دیوانہ پن سے ہے
سراغِ رشتہ ہائے ملک و مِلّت ڈھونڈنے والو
ہمارا سلسلہ تو ایک زلفِ پُر شکن سے ہے
اِدھر سے عرضِ غم ہے اور کس کس تلخ کامی سے
اُدھر سے عذرِ غم ہے اور کس کس بانکپن سے ہے
زمانہ لاکھ ہو چیں بر جبیں پروا نہیں اس کی
مجھے اے دوست! شکوہ تیرے ابرو کی شکن سے ہے
مری آوارگی پہونچی بالآخر اِس نتیجے پر !
کہ رشتہ شہرِ جاں کا خانۂ ویرانِ تن سے ہے
رَبِیْش انجام کیا ہونا ہے اِس تنہا نشینی کا
وطن میں رہ کے بھی دوری مجھے اہلِ وطن سے ہے

بتا کیا کیا تجھے اے شوقِ حیراں یاد آتا ہے
وہ جانِ آرزو وہ راحتِ جاں یاد آتا ہے
پریشاں خاطری حد سے گذرتی ہے تو وحشت میں
کسی کا عالمِ زلفِ پریشاں یاد آتا ہے
گذرتا ہے کبھی جب چودھویں کا چاند بدلی سے
مہین آنچل میں اُن کا روئے تاباں یاد آتا ہے
اندھیری رات میں جگنو چمکتے ہیں تو رہ رہ کر
دوپٹے کے ستاروں کا چراغاں یاد آتا ہے
اُفُق پر پھیلتی ہیں سرخیاں جب صبحِ تازہ کی
کوئی سینہ پسِ چاکِ گریباں یاد آتا ہے
کلی کو پھول بنتے دیکھ کر عہدِ بہاراں میں
کوئی چہرہ بہت نوخیز و خنداں یاد آتا ہے
غزل جب چھیڑ دیتا ہے کوئی عہدِ جوانی کی
کسی کا جسمِ موزوں و غزل خواں یاد آتا ہے
وفورِ شوق سے خود ہاتھ اپنے چوم لیتا ہوں
وفورِ شوق میں جب ان کا داماں یاد آتا ہے
بہت کچھ یاد آتا ہے رئیسؔ ان کی جدائی میں
مگر جیسے کوئی خوابِ پریشاں یاد آتا ہے

مل جائے شناسا نہ کوئی راہِ طلب میں
کچھ دیر کو چھپ جایئے ٹیلوں کے عقب میں
اِک حُور سے ہوتی ہے ملاقات سَرِ شام
اِک روح ڈراتی ہے مجھے آخرِ شب میں
میں وقتِ گریزاں کے تعاقب میں رواں ہوں
اور وقتِ گریزاں ہے رواں میرے عقب میں
انفاسِ سحر لاکھ سہی ترجمۂ شوق
کچھ اور بھی کہنا ہے مجھے لہجۂ شب میں
کیوں آج شبِ ہجر بہلتا ہی نہیں دل
شاید وہ پریشاں ہے کسی بزمِ طرب میں

رندوں کی داروگیر سے دنیا ہوئی خراب
لیکن خراب ہو کے خرابات ہو گئی

بامِ محبوب ہو ہزار بلند
دلِ وامانده صرف ایک زقند
اب کہاں محرمانِ منزلِ دوست
کارواں آمد و ہمہ رفتند
میں نے پوچھا کہ ہجر کے آنسو
گفت زہرے لذیذ تر از قند
میں نے پوچھا کہ رَختِ جاں؟ تو کہا
یک لباسِ کثیف و صد پیوند
جھک کے اِس مے کدے میں آخرِ کار
ہمہ یاراں یکے یکے خُفتند
اندریں مے کدہ چہ می خواہی؟
اے سکھی! آن! ناسکھی آنند
سن کہ کوئی پکارتا ہے تجھے
دل دریں کارواں سرائے مَبند
میں نے پوچھا کہ خانوادۂ قیس
گفت قومے ضعیف و زار و نژند

گوپیاں، شیام، بانسری، متھرا
نکتہ ہا بود و رازہا بودند!
ایک دل اور حسرتیں اتنی؟
یک غزالے و صد ہزار کمند
ایک تاریخ چند افسانے
گور و بہرام و صیدگاہ و کمند

پہلے تو ساتھ ساتھ ابد اور اَزل گئے
پھر ہم حدودِ کون و مکاں سے نکل گئے
اب تک ہیں حُسن و عشق کی کیفیتیں وہی
صرف اِس قدر ہوا کہ تقاضے بدل گئے
جلوے ہوئے حیات کے صرفِ نمودِ عشق
جو بچ گئے وہ حُسن کے سانچے میں ڈھل گئے
کچھ ایسے سانحے تھے کہ ممکن نہ تھا گریز
کچھ ایسے حادثے تھے کہ ٹلے سے ٹل گئے

یہ کیسا گیت ہے اے نے نوازِ عالم ہُو
کہ نے سے راگ کے بدلے ٹپک رہا ہے لہو
بہارِ صبح کے نغمہ گردں کو کیا معلوم ؟
گذر گیا گل و غنچہ پہ کیا عذابِ نمو
اگر نقاب الٹ دے تو کیا قیامت ہو
وہ جانِ گل کہ کبھی رنگ ہے کبھی خوشبو
مےِ نشاط انڈیلی تھی ہیں نے ساغر ہیں
کہاں سے آئی یہ زہرِ غمِ حیات کی بُو
ہوائے صبح نہ جانے کہاں سے آئی ہے
مچل رہی ہے فضایں اک اجنبی خوشبو
جہاں جو وجد ہیں آتا ہے نعرۂ ہو سے
عجب نہیں کہ جہاں ہو خود ایک نعرۂ ہُو
ہیں ایک قطرہ لہو سے امید کیا رکھوں؟
یہ کائنات ہے کیا ؟ صرف ایک قطرہ لہو
کسی کی بات ہیں تیرے سکوت میں اعجاز
کسی کے لطف ہیں تیرے گریز ہیں جادو

سزائے ہجر لرزتا ہے جس سے قلبِ حیات
مجھے قبول بشرطیکہ اُس کا اجر ہو تُو

بہت خجل ہوں تری آستینِ ناز سے میں
کہ جوشِ غم تو وہی ہے مگر کہاں آنسو

یہ حادثاتِ شب و روز بے سبب تو نہیں
بدل رہا ہے کوئی خوابِ ناز میں پہلو
تمھیں شکستہ دلوں کا خیال ہی تو نہیں
خیال ہو تو کرم کے ہزار ہا پہلو

متاعِ غم ہے کسی کو بہت عزیز اے دل!
بہ احتیاطِ محبت میں صَرف کر آنسو
شگفتگی کو ٹٹولا فسردگی پائی!!
مسرّتوں کو نچوڑا ٹپک پڑے آنسو

اُف رے ہجومِ نطق کہ خاموش ہوگئے
ہم غایتِ ظہور سے روپوش ہوگئے

بابا جو مہر و ماہ میں ذوقِ سپردگی
ذرّے تمام حلقۂ آغوش ہوگئے

اے گوشِ وقت! سُن کہ ادا کر رہا ہوں میں
وہ لفظ جس کے حرف فراموش ہوگئے

چھیڑا تھا ہم نے جسم کی خلوت میں سازِ جاں
جب ساز چھڑ گیا تو گراں گوش ہوگئے

ساقی کے بندوبست سے رندانِ کم طلب
تنگ آئے اِس قدر کہ بَلانوش ہوگئے

کتنے معانقے تھے کہ بے جذبۂ وصال
صرفِ فشارِ سینہ و آغوش ہوگئے

دیکھ اے لباسِ تنگِ وجودِ بشر کہ ہم
عیبِ برہنگی سے کفن پوش ہوگئے

رقصاں ہے منڈیر پر کبوتر !
دیوار سی گر رہی ہے دل پر
ٹہنی پہ خموش اِک پرندہ
یادوں کے اُلٹ رہا ہے دفتر
اڑتے ہیں ہوا کی سمت ذرّے
یادوں کے چلے ہیں لاؤ لشکر
پیڑوں کے گھنے مہیب سائے
یہ کون ہے مجھ پہ حملہ آور ؟
پتّوں میں جھپک رہی ہیں آنکھیں
شاخوں میں چمک رہے ہیں خنجر
یہ کون قریب آرہا ہے
خود میرے ہی نقشِ پا پہ چل کر
یہ کون سما رہا ہے مجھ میں
بیٹھا ہوا چپ مری برابر

غمِ فراق کا تنہا علاج دوری ہے
دلِ حزیں! یہ کنارہ کشی ضروری ہے
جمالِ دوست کی جانب کشش ہے عینِ شعور
رہا گریز تو وہ جذبِ لاشعوری ہے
ابھی سے مُہر بلب ہو نہ اے گُلِ نوخیز
ابھی شگفتنِ غنچہ کی بات اَدھوری ہے
فروغِ حُسن سے ہو کر گذر رہا ہوں میں
ہر ایک لمحۂ دید ایک سالِ نوری ہے
بس اِک تصوّرِ دُوری بس اِک تخیّلِ قُرب
وگرنہ غیب ہے کیا اور کیا حضوری ہے؟
ابھی سکوں ہے ابھی قلزمِ حوادث کو
عبور کر کہ یہ دَورِ سکُوں عبوری ہے
فراقِ دوست میں اب تک نصیب ہو نہ سکا
نشاطِ وصل میں جو کربِ ناصبوری ہے

شمیم گُل ! قفسِ گُل سے کر بھی جا پَرواز
سُبک روی ہو تو عزمِ سفر ضروری ہے
اُبل رہا ہے اندھیروں سے سیلِ جلوہ و رنگ
کھُلا کہ ظلمتِ غم کا مزاجِ نوری ہے
یہ معجزہ کہ ہر اِک عہد کی ہوئی تکمیل
یہ حادثہ کہ ہر اِک داستاں ادھوری ہے

ہر انقلاب جہاں انقلاب زندہ باد
رواں دواں گذراں انقلاب زندہ باد
زمیں پہ نازِ ثباتِ قدم نہ کر اے دوست
کہ منقلب ہے جہاں انقلاب زندہ باد
بڑھے چلو کہ وہ ہے انقلاب کی منزل
جرس ہے نعرہ زناں انقلاب زندہ باد
ترا سوال کہ ہے انقلاب حاصلِ زیست؟
مرا جواب کہ ہاں انقلاب زندہ باد!

سیاہ ہے دلِ گیتی سیاہ تر ہو جائے
خدا کرے کہ ہر اک شام بے سحر ہو جائے
کچھ اِس روش سے چلے بادِ برگ ریزِ خزاں
کہ دور تک صفِ اشجار بے ثمر ہو جائے
بڑھے جو ہاتھ چمن میں بہ قصدِ گُل چینی
مثالِ پنجۂ قصّاب خوں میں تر ہو جائے
زمانہ پی تو رہا ہے شرابِ دانش کو
خدا کرے کہ یہی زہر کارگر ہو جائے
یہ لوگ رہ گذرِ زیست میں بھٹک جائیں
اجل قوافلِ ہستی کی ہم سفر ہو جائے
بجائے رنگ رگِ غنچہ سے لہو ٹپکے!
کِھلے جو پھول تو ہر برگِ گُل شرر ہو جائے
بقدرِ یک دو نفس بھی گراں ہے زحمتِ زیست
حیاتِ نوعِ بشر اور مختصر ہو جائے

شرار و شعلہ و برق افگنی کے ساتھ آئی
بہار اب کے بڑی روشنی کے ساتھ آئی
وہ شے جسے خلشِ انتظار کہتے ہیں
اجل کے ساتھ گئی زندگی کے ساتھ آئی
خوشا یہ خاک کہ اِس خاک پر عروسِ حیات
خدا کے ساتھ نہیں آدمی کے ساتھ آئی
فراقِ دوست بلا ہی سہی مگر یہ بلا
کبھی کبھی تو بڑی دِل کشی کے ساتھ آئی!
دلِ حزیں ہے اندھیروں سے مطمئن لیکن
شبِ فراق اگر چاندنی کے ساتھ آئی؟
ترے لبوں پہ گلستاں کھلا گئی کیا کیا
وہ اک ہنسی جو بہت بیدلی کے ساتھ آئی
مجھے بتا نہ سکے محرمانِ جلوۂ صبح!
وہ کیا سحر تھی جو اِس تیرگی کے ساتھ آئی

دل کسی مستِ ناز تک پہونچے
یہ حقیقت مجاز تک پہونچے
سلسلہ کاش میری وحشت کا
تیری زلفِ دراز تک پہونچے
جس طرف بھی سفر کیا ہم نے
اُسی فتنہ طراز تک پہونچے
اب کہاں جائیں گے یہ اہلِ نیاز
ناز والے نیاز تک پہونچے
اے مری سر گذشتِ رسوائی!
تو کسی اہلِ راز تک پہونچے
مدّعیانِ حق کو کیا معلوم؟
ہم بمشکل مجاز تک پہونچے
دل کے جلنے کا درد کیا کہ رئیسؔ
تم کسی دلنواز تک پہونچے

اُن کا نطقِ دل آویز یاد آگیا
لہجۂ طنز آمیز یاد آگیا
سَر اٹھایا جو سرمستیٔ شوق میں
قدِّ بالا بلا خیز یاد آگیا
میں جو اِس حال میں مسکرانے لگا
وہ تبسم دل آویز یاد آگیا
عالمِ لطف میں مسکراتے ہوئے
غمزۂ چشمِ خوں ریز یاد آگیا
غمزۂ چشمِ خوں ریز کے ساتھ ہی
عشوۂ مہر آمیز یاد آگیا
یاد آئی شبابِ خود انگیز کی
اور جمالِ کم آمیز یاد آگیا
یارِ بے مہر اور مہرباں اِس طرح
جیسے شیریں کو پرویز یاد آگیا

جب اِدھر سوزِ محبّت میں کمی ہوتی ہے
دیکھتا ہوں تو اُدھر آگ لگی ہوتی ہے

جب بھی دیتا ہے کوئی ترکِ وفا کے طعنے
انتقاماً مرے ہونٹوں پہ ہنسی ہوتی ہے

کوئی اِس پہلوئے مجبوب طلب میں کسی رات
نہیں ہوتا تو نسیمِ سحری ہوتی ہے

پہلے دل خندۂ گُل سے بھی لرز جاتا تھا
اب کوئی خون بھی روئے تو خوشی ہوتی ہے

شارحینِ چمن اے کاش اُسے پڑھ سکتے
جو حکایت ورقِ گُل پہ لکھی ہوتی ہے

جوانی کا یہ عالم ہو رہا ہے
فروغِ مے مجسّم ہو رہا ہے

عروجِ نسلِ آدم ہو رہا ہے
وقارِ آدمی کم ہو رہا ہے

وہ اُبھرا مہرِ نو اور بزمِ شب میں
ابھی تاروں کا ماتم ہو رہا ہے

جو زندگی سے تہی ہو وہ عاشقی کیا ہے
مگر سوال تو یہ ہے کہ زندگی کیا ہے؟
شبِ فراق کے تارے مجھے بتا نہ سکے
اُفق کے پار یہ دھندلی سی روشنی کیا ہے؟
جبینِ غنچہ و گُل سے ٹپک رہا ہے لہو
کسے خبر کہ مآلِ شگفتگی کیا ہے
ترے حضور حیاتِ فراق کا کیا ذکر
ترے بغیر جو گزری وہ زندگی کیا ہے
حرم میں معرفتِ کردگار پہ تھی نزاع!
صدا یہ دَیر سے آئی کہ آدمی کیا ہے
ابھی سے شکوۂ پست و بلند ہم سفرو!
ابھی تو راہ بہت صاف ہے ابھی کیا ہے؟
حیات وہم و گماں ہے مجھے قبول مگر
حیات وہم و گماں ہے تو واقعی کیا ہے
چمن چمن جو خزاں کا ہے غلغلہ تو بھلا
روش روش یہ نمودِ بہار سی کیا ہے؟

تم اپنے سوزِ نہاں کا مجھے ثبوت نہ دو
کہ جس سے آگ نہ بھڑکے وہ آگ ہی کیا ہے؟
مہ و ستارہ سے عالم کو دے رکھا ہے فریب
تری تجلّیِ عالم فریب بھی کیا ہے؟
وہ عشق کفر ہے یہ راز جو بتا نہ سکے
حیات کیا ہے؟ جنوں کیا ہے؟ آگہی کیا ہے؟
نگار خانۂ کُن کو سنوارنے والے
مجھے بتا کہ ترا نقشِ آخری کیا ہے؟
رئیسؔ شیوۂ رندانہ اِس زمانے میں
خلافِ وضع سہی، پر کبھی کبھی کیا ہے؟

راضی نہیں طبیعت تقلیدِ کارواں پر
دانستہ چل رہا ہوں اِک راہِ بے نشاں پر

سرد مہری کی کوئی بات اِدھر ہے نہ اُدھر
پھر بھی وہ گرمئ جذبات اِدھر ہے نہ اُدھر
دونوں جانب سے ہیں اصرار ملاقاتوں کے
اور ارمانِ ملاقات اِدھر ہے نہ اُدھر
دونوں جانب ہیں شکایت کے بہت سے اسباب
اور اقرارِ شکایات اِدھر ہے نہ اُدھر
دونوں جانب سر و سامان ہیں پذیرائی کے
اور اخلاصِ مدارات اِدھر ہے نہ اُدھر
دونوں جانب وہی آسودگی حال کا ذکر
اور اندازۂ حالات اِدھر ہے نہ اُدھر
نہ تلطّف نہ تغافل نہ توجّہ نہ گریز
کوئی تحفہ کوئی سوغات اِدھر ہے نہ اُدھر
دونوں جانب ہے رہ و رسم کا انداز وہی
ذوقِ تجدیدِ روایات اِدھر ہے نہ اُدھر
کتنی باتیں ہیں کہ ہیں قابلِ اظہار رئیس
اور ظاہر میں کوئی بات اِدھر ہے نہ اُدھر

ہم سے جب تک دوستی کے حق ادا ہوتے رہے
التفاتِ خاص کے وعدے وفا ہوتے رہے
زندگی میں نو بہ نو تبدیلیاں آتی رہیں
دل نئی کیفیتوں سے آشنا ہوتے رہے
دونوں جانب ذوق و شوقِ مدّعا کے باوجود
جمع کچھ اسبابِ ترکِ مدّعا ہوتے رہے
بعض فتنوں سے بظاہر سامنا کرنا پڑا
بعض ہنگامے پسِ پردہ بپا ہوتے رہے
پہلے پہلے ایک منزل تھی مگر انجامِ کار
راستے آہستہ آہستہ جُدا ہوتے رہے
اب کہاں باقی وہ آشفتہ مزاجی عشق کی
جب تک اُن سے ربط تھا ہم بھی خفا ہوتے رہے

قہر تھیں التفات کی باتیں
بن گئیں ایک بات کی باتیں
عمر بھر کی کہانیوں کا نچوڑ
آپ کی ایک رات کی باتیں
آج بھی اُن سے بات چیت رہی
بس وہی کائنات کی باتیں
آج کچھ مجھ کو عرض کرنا ہے
چھوڑ دیجئے التفات کی باتیں
اُن لبوں کی حلاوتوں کا بیاں
شہد و قند و نبات کی باتیں
اہلِ کعبہ بُتوں کے منکر ہیں
کیا یہی ہیں نجات کی باتیں؟
اُن کے دورِ شباب کے قصّے
میرے عہدِ حیات کی باتیں

راتوں کی جو چھڑ گئی ہیں باتیں!
باتوں میں گذر گئی ہیں راتیں
کیا قہر تھی اِک نگاہ اُن کی
یاد آگئیں لاکھ وارداتیں!
تم مجھ سے سنو مری کہانی
یوں جتنی زبانیں اتنی باتیں
ہم لوگ بجائے خود ہیں دُنیا
دُنیا نے بنا رکھی ہیں ذاتیں
ناصح نے بُتوں کا ذکر چھیڑا
حضرت کی ملاحظہ ہوں باتیں
اے ناظرِ کائنات! دیکھیں؟
ذرّے کی لطیف کائناتیں!
بھُولا نہیں عہدِ وصل میں بھی
دن ہجر کے بالخصوص راتیں

حقیقت کیا ہے اس کربِ نہاں کی!
یہ قیمت ہے تو کس جنسِ گراں کی
غبار آلود ہے کیوں چہرۂ وقت
یہ آخر گرد ہے کس کارواں کی؟
محبّت ہے نیاز آئیں تو اے دل!
یہ تجھ میں بے نیازی ہے کہاں کی
معاذ اللہ کربِ خلقتِ گل!
چمن کے رُخ پہ زردی ہے خزاں کی
کتابِ دل مکمل تھی مگر اب!
عبارت اُڑ رہی ہے درمیاں کی
نہ دے مجھکو گراں گوشی کے طعنے
صدا نازک بہت ہے سازِ جاں کی
ہمیں سے کاروبارِ شوق و مستی
ہمیں پر سختیاں کارِ جہاں کی

زندگی عارض وگیسو کے سوا اور بھی ہے
اِک سحر اور بھی اِک شامِ بلا اور بھی ہے
سحر و شام کے محسوس حوادث کے سوا
کوئی ہنگامہ پسِ ارض و سما اور بھی ہے
سینۂ ساز میں نغموں کا تلاطم ہی نہیں
دلِ مطرب کے دھڑکنے کی صدا اور بھی ہے
عشق ہی مستحقِ دار نہیں ہے کہ یہاں
عقل مستوجبِ تعزیر و سزا اور بھی ہے
مطمئن ہو نہ شگفتِ گل وغنچہ سے بہار
اس چمن میں روشِ بادِ صبا اور بھی ہے
زیست اِک عقدۂ مشکل ہے مگر مشکل تر
یہ شعورِ ابد و ذوقِ بقا اور بھی ہے
گلہ ہے گلہ ہے جسے تم بھی نہیں کرتے محسوس
تم میں اک ایسی پُراسرار ادا اور بھی ہے

ڈھل گئی ہستی، دل یوں تری رعنائی میں
مادّہ جیسے نکھر جائے توانائی میں
پہلے منزل پسِ منزل پسِ منزل اور پھر
راستے ڈوب گئے عالمِ تنہائی میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں خود اپنی بصیرت کی حدود
کھو گئی ہیں مری نظریں مری بینائی میں
اُن سے محفل میں ملاقات بھی کم تھی نہ مگر
اُف وہ آداب جو برتے گئے تنہائی میں
یوں لگا جیسے کہ بَل کھا کے دھنک ٹوٹ گئی
اُس نے وقفہ جو لیا ناز سے انگڑائی میں
ہم بہر حال ترے قرب کے جویا ہیں مگر
وصل کا لطف ہے کچھ خطرۂ رسوائی میں
کس نے دیکھے ہیں تری روح کے رِستے ہوئے زخم
کون اترا ہے ترے قلب کی گہرائی میں؟

شعورِ انساں کے کارنامے اگرچہ واضح بھی عام بھی ہیں
مگر جہاں خود شعور گُم ہے کچھ ایسے نازک مقام بھی ہیں
نجانے نقّاش کا تخیّل ازل سے ہے کس اُدھیڑ بن میں
کہ زندگی کے تمام خاکے تمام بھی ناتمام بھی ہیں
حیات کے قافلوں سے کہہ دو سنبھل کے دیر و حرم سے گذریں
کہ ارتقائے بشر کی منزل میں چند مشکل مقام بھی ہیں
رُموزِ ہستی ہیں سخت مبُہم روایتوں کا یقیں نہ کرنا
کہ راویانِ رموزِ ہستی روایتوں کے غلام بھی ہیں
عجب نہیں گر بھٹک رہے ہیں جنون و حکمت رہِ طلب میں
یہ وادیاں ہولناک بھی ہیں یہ قافلے سُست گام بھی ہیں
فضا میں گستاخ اڑنے والے! فضا میں ہیں بجلیاں پَرافشاں
زمیں پہ مغرور چلنے والے! زمیں کے ہمرنگ دام بھی ہیں
زمانہ صدیوں کی گردشوں میں جنہیں بمشکل سمجھ سکے گا!
سُنا ہے اِس عہد کے لبوں پر کچھ ایسے مبہم پیام بھی ہیں

یہ شامِ غم ہی نویدِ فروغِ جاں تو نہیں
پسِ غبار کوئی تازہ کارواں تو نہیں!
تلاشِ دوست بہانہ ہے جہاں تو نہیں
جنوں خود اپنے لیے ہی رواں دواں تو نہیں
ہوائے تند حوادث اُڑا رہی ہے جسے!
وہ مشتِ خاک ہی سرمایۂ جہاں تو نہیں
ٹھہر گیا ہے جہاں کاروانِ فکر و شعور
وہ تیرا در تو نہیں تیرا آستاں تو نہیں!
جہاں خود ایک تصوّر سہی مگر اے دوست!
جہاں پہ کوئی تصوّر ہی حکمراں تو نہیں
شگافِ سنگ سے اُبھرا ہے لالۂ کہسار!
یہ کوہ کَن کا کوئی زخمِ خونچکاں تو نہیں؟
تڑپ رہی ہے فضائے بہار میں بجلی
یہ انتقامِ طیورِ تپیدہ جاں تو نہیں

عظمتیں اصنام کی اب کچھ سمجھ میں آ گئیں
تیشۂ فرہاد کی ضربیں تھیں جو پتھرا گئیں
ہائے کیا ہوتا جو قیدِ زیست ہوتی ناگوار
یہ غنیمت ہے کہ زنجیریں ہمیں راس آ گئیں
اوّل اوّل آئنہ تھا اور عکسِ رنگ رنگ
آخر آخر آئنے پر حیرتیں سی چھا گئیں
جن سے رونق تھی بہاروں کی وہ کلیاں اب کہاں؟
اپنے اپنے وقت پر جاگیں کھلیں مرجھا گئیں
ہے ازل سے قلزمِ اسرارِ ہستی بے خروش
چند موجیں ہیں کہ ساحل پر اُچھل کر آ گئیں
اللہ اللہ اِک طلوعِ صبح کا یہ اہتمام
کتنی شمعیں بجھ گئیں کتنی بلائیں آ گئیں
اب حضورِ دوست از خود رفتگی بھی ہے محال
ہم جہاں کھوئے گئے ان کی نگاہیں پا گئیں

آسماں پر چاند تاروں کی صفیں تھرّا گئیں
شب کے تہ خانے میں دو پرچھائیاں ٹکرا گئیں
روزنِ دیوارِ حجرہ میں یہ ذرّوں کا ہجوم
ایک دل میں اتنی دنیائیں کہاں سے آگئیں؟
میری جانب بڑھ رہی ہیں اَن گنت پرچھائیاں
اَن گِنت پرچھائیاں تم آ گئے تم آ گئیں!

یادِ ماضی سے دلِ حسّاس آخر کیا ملا
ایک مبہم سی خلش بیدار ہو کر رہ گئی
صُبح کو سورج اُبھر کر بدلیوں میں چھُپ گیا
دھوپ نذرِ سایۂ دیوار ہو کر رہ گئی

جب بھی غمِ دل پہ بار گذرا ہے
آپ کو ناگوار گذرا ہے!
ہے گذرگاہِ دل میں حشر اب تک
وہ فقط ایک بار گذرا ہے
ہے معطّر دماغِ لالۂ و گل
کیا وہ جانِ بہار گذرا ہے؟
ہائے وہ کیفِ انتظار کہ جب
اُن کا آنا بھی بار گذرا ہے
یاد ہے عہدِ عاشقی کہ وہ دَور
واقعی یادگار گذرا ہے!
ہم خزاں کے مزاج داں ہیں رئیسؔ
ہم پہ عہدِ بہار گذرا ہے

ممکن نہیں کہ دیکھ سکوں تا بحدِّ ذوق
کہنے کو تا بحدِّ نظر دیکھتا ہوں میں

جو نئی دنیا ابھی تخلیق کی منزل میں ہے
اسکا کربِ آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے
میں حضورِ دوست فکرِ دوش و فردا کیا کروں
یہ وہ لمحہ ہے جو ماضی میں نہ مستقبل میں ہے
ریگِ ساحل سے اُلجھ کر کہہ رہی ہے موجِ تُند
سینۂ طوفاں کی شورش بھی دلِ ساحل میں ہے
اے سکوتِ جبر! حرفِ شوق کے محرم بہت
جو مرے لب پر نہیں وہ دوسروں کے دل میں ہے
عِشق کو جُز شانہ و گیسو جنوں سے کیا ملا؟
عقل ہی مُشکل کُشا ہے عقل ہی مُشکل میں ہے

زندگی جس کی تمنّا میں بسر ہوتی ہے
کیا اُسے بھی مری حالت کی خبر ہوتی ہے

خلوت کدۂ دل کی اللہ رے پہنائی
میں خود بھی سمٹ آیا دُنیا بھی سمٹ آئی
اے نوعِ بشر! اپنی تقدیر کو پورا کر
مجبوری و مختاری نادانی و دانائی
اِتمام ہوا تجھ پر ہر ایک تماشے کا
اب کس کے لیئے وا ہے اے چشمِ تماشائی
کیوں کتنے جہاں میں نے ذرّوں سے تراشے ہیں؟
بول اے مرے ویرانے! چیخ اُو مری تنہائی
پیغام سُنانے کو آئی تھی بہار اُن کا
اے نکہتِ آوارہ! تو کس کی خبر لائی
شکوے ہوں کہ خطرے ہوں منسوم محبّت ہیں
شکوے وہی بے مہری خطرے وہی رسوائی
اب دور نہیں ہم سے تسخیرِ مہ و انجم
کچھ اور قریب آجا اے گنبدِ مینائی!

صنم کدے ہوں کہ خانقاہیں، ظہورِ فتنہ کہاں نہیں ہے
گریز اے آہوانِ کعبہ! کہ اب کسی کو اماں نہیں ہے
عجائباتِ جہاں کے بارے میں گفتگو تھی تو دل سے فوراً
صدا یہ آئی کہ اس جہاں سے عجیب تر وہ جہاں نہیں ہے
شگفتہ ہو ہو کے کہہ رہا ہے ریاضِ ہستی کا غنچہ غنچہ
کہ ناظمِ رنگ و بو ابھی تک بہار سے بدگماں نہیں ہے
مہ و ستارہ کی انجمن میں نہ شوقِ حیراں بہل سکے گا
کہ خود یہ جس کی نشانیاں ہیں اُسی کا کوئی نشاں نہیں ہے
جو عصرِ تازہ کے منتظر ہیں وہ کاش یہ حادثہ بھی دیکھیں
کہ عہدِ حاضر سسک رہا ہے مگر کوئی نوحہ خواں نہیں ہے
قدم قدم پر سوادِ منزل کا ہے اشارہ کہ اے مسافر
بھٹک رہا ہے تو جس کی خاطر وہ گرد ہے کارواں نہیں ہے

تجھ سے خفگی یہ رَوش ہم سے بہت دُور سمجھ
آپ اپنے سے اُلجھ جائیں تو معذور سمجھ
آبگینوں کی طبیعت کا تقاضا ہے شکست
دل شکستہ ہوں کہ ثابت ہوں اُنہیں چوُر سمجھ
حق جسے کہتے تھے وہ مُنکرِ منصور تھا کل
آج جو منکرِ حق ہو اُسے منصور سمجھ
ابھی اِس راہ میں کچھ نقشِ قدم ملتے ہیں
شہرِ جاناں کو ابھی دُور بہت دُور سمجھ
بے رُخی ہم سے مناسب نہیں اے لالۂ کوہ
ہم کو بھی سوختۂ سامانِ سرِ طُور سمجھ
ہائے وہ ولولۂ عرضِ تمنّا میرا
اور اِک شخص کا کہنا ہمیں معذور سمجھ
تو بھی تو وضعِ محبّت سے ہے ناچار اے دل
اُن کو بھی قاعدۂ ناز سے مجبور سمجھ

فغاں ایجاد ہوکر رہ گیا ہوں
لبِ فریاد ہوکر رہ گیا ہوں
ذرا اے انقلابِ وقت دم لے
کہ میں برباد ہو کر رہ گیا ہوں
مجھے ختم اسیری سے ملا کیا
فقط آزاد ہوکر رہ گیا ہوں!
خبر لو اے خرابانِ خرابات
خراب آباد ہوکر رہ گیا ہوں
تمھیں دل سے بھلا دینے کے باوصف
تمھاری یاد ہوکر رہ گیا ہوں
مری تخلیق نغمے سے ہوئی تھی
مگر فریاد ہوکر رہ گیا ہوں

باہمہ قربتِ دل و دیدہ
ہائے وہ دل نشین و نادیدہ
کتنی صبحیں گذر گئیں لیکن
زندگی آج بھی ہے خوابیدہ
تیرے گیسو کی ہر گرہ اے دوست!
ہے مرے دل کی طرح پیچیدہ
سینۂ سنگ میں تڑپتے ہیں!
کتنے اصنامِ نا تراشیدہ
تو نے کیا کہدیا دلِ مشتاق
وہ کئی روز سے ہیں سنجیدہ
مجھ سے ہی طالبِ پرستش ہیں!
میرے اصنامِ خود تراشیدہ

آؤ کچھ شغل کریں آج سحر ہونے تک
توبہ کرلیں گے فرشتوں کو خبر ہونے تک

جوشِ وحشت نے بیاباں کو کیا یوں برباد
خاک باقی نہ رہی خاک بسر ہونے تک

اور ہوجائے گا کچھ شمس و قمر کا مفہوم
ذرّہٴ خاک! ترے شمس و قمر ہونے تک

ہم بھی تھے پیش رَوِ لشکرِ شاہین و عقاب
بَر طرف قاعدہٴ جنبشِ پر ہونے تک

فائدہ قافلے والوں کی حُدی خوانی سے؟
شوقِ منزل نہ رہا اِذنِ سفر ہونے تک

موت کے کتنے مراحل سے گذرنا ہے ہمیں
آخری مرحلہٴ زیست کے سر ہونے تک

کون بتلائے کہ کہسار پہ کیا کیا گذری؟
سینہٴ سنگ میں ہیجانِ شرر ہونے تک

میں اُن کو بھول کے اپنی تلاش میں گم ہوں
یہ وہ مقامِ طلب ہے جہاں خرد نہ جنوں
یہ نازِ حسن ہے یا امتحانِ عشق اے دوست
کہ تیرے ساتھ رہوں اور تجھ کو پا نہ سکوں!
ریاضِ دہر سے اے دوست! سرسری نہ گذر
رَوِش رَوِش ہے تحیّر فروش و بوقلموں
ہر ایک گُل کی جبیں پر لکھا ہوا ہے کیا؟
ہر ایک غنچے کے دل میں کھُدا ہوا ہے کیوں؟
جمالِ لالہ و گُل کیا ؟ خیال ہے اتنا
چمن کو ہم نے بھی دیکھا ہے غرقِ قلزمِ خوں
بس ایک آگ ہے جو حسن میں ہے گرمیِ ناز
مزاجِ عشق میں ٹھہرے اگر تو سوزِ دروں
سما گئی ہے نظر میں یہ کس کی وضع جمیل؟
بدل رہا ہے زمانہ لباسِ گوناگوں !

یہ کیا کہ چہرۂ حق جب بھی بے نقاب ہوا
فسوں زدوں کو نظر آئے خدّ و خالِ فسوں
ستارۂ سحر و شمعِ نیم شب کی قسم!
یہاں فروغِ نفس ہے بقدرِ سوزِ دروں
نمو کا جوش ہوا صرفِ رنگ و بو ورنہ
عجب نہ تھا کہ اُبلتا زمیں سے چشمۂ خوں
رَئیسؔ یاد ہیں لاکھوں حکایتیں لیکن
کوئی سُنے تو سناؤں کوئی کہے تو کہوں

کتنی صُبحیں تھیں کہ نذرِ فکرِ دنیا ہوگئیں
کتنی شامیں تھیں کہ غرقِ جامِ صہبا ہوگئیں
تو نے سوچا بھی کبھی اے بختِ بیدارِ فراق!
وصل کی راتوں کو کیا ہونا تھا اور کیا ہوگئیں

مری آوارگی پہونچی بالآخر اِس نتیجے پر
کہ رستہ شہرِ جاں کا خانۂ ویرانِ تن سے ہے
رئیسؔ انجام کیا ہونا ہے اِس تنہانشینی کا
وطن میں رہ کے بھی دُوری مجھے اہلِ وطن سے ہے

لیلیِ محمل نشیں ! پردہ درِ ناز ہو
قیسِ جنوں آفریں ! غلغلہ انداز ہو
دستِ گریباں کُشا ! عالمِ وحشت دِکھا
پائے خرام آزما محوِ تگ و تاز ہو
نغمۂ جاں بخش تھم ، نالۂ جاں سوز چل
صُبحِ طرب ختم ہو شامِ غمِ آغاز ہو

شروعِ عشق کا یارب! عجب زمانہ تھا
زمانے بھر سے مرا طرز باغیانہ تھا
نظر نظر کو میسّر نئی تجلّی تھی!
قدم قدم پہ مرتّب نیا فسانہ تھا
حضورِ حُسن بھی باوصفِ اعترافِ شکست
مری نگاہ کا انداز جارحانہ تھا
گدائے بوسہ کو پروائے وصلِ دوست نہ تھی
غریبِ شہر کا انداز خسروانہ تھا
رئیسؔ اُن کی جوانی بھی کیا جوانی تھی
رئیسؔ اپنا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا

رئیسؔ اہلِ ہوس جس کو نشاطِ زیست کہتے ہیں
وہ دنیا ہم نے دیکھی تو مگر کچھ سرسری دیکھی

عشقِ شیریں ہو تو عقلِ کوہ کن بھی چاہیے
کوہ کن کو تیشۂ خارا شکن بھی چاہیے
شاخِ گل کی آبیاری ہی نہیں فرضِ بہار
شاخِ گل کو رنگ و بو کا پیرہن بھی چاہیے
ہم یقیناً کوچۂ جاناں کے طالب ہیں مگر
راہ میں اک منزلِ دار و رسن بھی چاہیے
دشتِ غربت کی ہے آوارہ بگولوں کو تلاش!
آخر ان خانہ بدوشوں کو وطن بھی چاہیے
اُف یہ سنّاٹا کہ اپنی روح سے ہوں ہم کلام
ایسے سنّاٹے میں کوئی ہم سُخن بھی چاہیے

وہ چیز جس کا نام ہے پیچ و خمِ حیات
تھی اور اُس کی زلفِ شکن در شکن میں تھی

کیوں بہاروں میں تغیر ہو خزاں کیوں بدلے
میری خاطر یہ جہانِ گزراں کیوں بدلے
انقلابِ روشِ دہر مسلم لیکن
روشِ مستیِ رندانِ جہاں کیوں بدلے؟
منظرِ حسن و تجلّی ہے سراپا نیرنگ
کائناتِ نگہ دیدہ وراں کیوں بدلے؟
اِس بدلتی ہوئی دنیا کی ہر اک شے بدلی
وہ مرا شاہدِ خلوت گہ جاں کیوں بدلے
ہر تماشے میں بدلتے ہیں نظر کے معیار
مگر اک بندۂ صاحب نظراں کیوں بدلے؟
لفظ و معنیٰ میں بہرحال تغیر ہوگا
شیوۂ بینشِ معنیٰ نگراں کیوں بدلے

آیا وہ مستِ ناز ک خرامی
نذرانہ جس کا جانِ گرامی
مخمور آنکھیں لبریز ساغر
سَرشار نظریں کیفِ دوامی
رنگیں ادائیں افکارِ خسرو !
حُسنِ مرتّب نظمِ نظامی
ابرو کا مصرع غالبؔ کا مطلع
روئے کتابی دیوانِ جامی
لہرا رہا ہے دریائے مستی
مجرا بجا لا اے تشنہ کامی
اُمڈا ہوا ہے طوفانِ بادہ
حیراں ہے میری بشکستہ جامی
ابرو سے اگر وہ کر دے اِشارہ
تقدیر لِکھ دے خطِّ غلامی

اُس نے جہاں بھی چاہی رفاقت
فتنوں نے بھرلی پیچھے سے ہامی
آیا وہ آیا اے دل وہ آیا
بادِ سحر تھی جس کی پیامی
نظمِ رئیسؔ اک نذرِ عقیدت
یا ربّ! قبولِ طبعِ گرامی

ہر طلب کے ساتھ ہیں مخصوص کچھ ناکامیاں
ورنہ یوں تو جو بھی طالب ہے وہی ناکام ہے
لاکھ عشقِ بُت شکن ہنگامہ آرا ہو مگر
حُسن کی فطرت کو اب تک خود گری سے کام ہے
دل جہاں آنسو بہا کر بھی بہل سکتا نہیں
اُس جگہ ہنس کر بسر کرنا ہمارا کام ہے

شب ہے اور بابِ انتظار ہے باز
دے رہا ہے کوئی فقیر آواز
دل کے تاروں کو چھیڑنے والے
تو ہے کس کے لیے نوا پرداز
اُن کو دیکھا کہ گفتگو کرلی!
ایک شے ہیں تجلّی و آواز
دل ہے لرزاں جو شاخِ گل کی طرح
دفعتاً کون کر گیا پرواز!
نغمہ سنجی میں نغمہ گر کا سکوت
باز گشتِ صدائے گنبدِ راز
داستانِ نگاہ و نظّارہ!
صرف آویزشِ کبوتر و باز!
زندگی شعبدہ سہی لیکن
شعبدہ بے وجودِ شعبدہ باز!

جو دن کو یادِ رُخ و زلفِ یار کرتے ہیں
وہ لوگ رات میں کیا کاروبار کرتے ہیں؟
کبھی جو اپنی خطائیں شمار کرتے ہیں
شمار میں غلطی بار بار کرتے ہیں
جنھیں نگارشِ لوحِ ابد کا دعویٰ ہے
فقط کتابتِ سنگِ مزار کرتے ہیں
سمجھ رہے ہیں کہ سادہ ہے صفحۂ تخلیق
مگر نمائش نقش و نگار کرتے ہیں
صحیفۂ اَبدی کا مطالعہ ہے محال
فقط کتاب کے صفحے شمار کرتے ہیں
یہاں کسی سے توقع نہیں حمایت کی
خود اپنی ذات سے اپنا حصار کرتے ہیں
رضائے دوست ہے مقصد خلوص ہو کہ ریا
رضا نہ ہو تو ریا اختیار کرتے ہیں

اپنے کو تلاش کر رہا ہوں!
اپنی ہی طلب سے ڈر رہا ہوں
تم لوگ ہو آندھیوں کی زد میں
میں قحطِ ہَوا سے مر رہا ہوں
خود اپنے ہی قلبِ خونچکاں میں
خنجر کی طرح اُتر رہا ہوں!
دیوار پہ دائرے ہیں کیسے؟
یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں
اک شخص سے تلخ کام ہوکر
ہر شخص سے پیار کر رہا ہوں
اے دجلۂ خوں! ذرا ٹھہرنا!
اس راہ سے میں گذر رہا ہوں
فریاد کہ زیرِ سایۂ گل!
میں زہرِ خزاں سے مر رہا ہوں
اے شہرِ خیال کے مسافر
کیا میں ترا ہم سفر رہا ہوں

کم یاب متاعِ جاں نہیں ہے
پر اِس کی کوئی دوکاں نہیں ہے
مرنا ہے تو شہد سے مریں ہم
گو زہر بھی کچھ گراں نہیں ہے
لمحوں پہ گرفت سخت رکھنا
صدیوں کا زیاں نہیں ہے
اب اہلِ طلب کی منزلوں میں
جُز ریگ کوئی رواں نہیں ہے
اِس گھر کے مکیں ہیں جِن گرفتہ
آسیب زدہ مکاں نہیں ہے
کیا قصد ہے اے مسافرِ شوق.
یہ گرد ہے کارواں نہیں ہے

گو سبھی مشقِ ستم سے آزمائے جائیں گے
وائے اُن پر جو کرم سے آزمائے جائیں گے
سلسلہ جنباں ہو اے وحشت کہ ہنگامے ترے
اُن کی زلفِ خم بہ خم سے آزمائے جائیں گے
کفرِ مطلق ! بندگانِ خاص تیرے تا کجا
فتنۂ دیر و حرم سے آزمائے جائیں گے
شرم اے ایماں ! کہ ہم سے بندگانِ خاص بھی
کفرِ انکارِ صنم سے آزمائے جائیں گے
خضرِ ہمّت کی منادی ہے کہ راہِ شوق میں
راہ رو پہلے قدم سے آزمائے جائیں گے
امتحانِ سعیِ ضبطِ غم ہیں ہم تنہا نہیں
وہ بھی سعیِ ضبطِ غم سے آزمائے جائیں گے
اُن کو دعوے ہیں بہت بندہ نوازی کے رتبیشؔ
آزمائیں گے جو ہم سے آزمائے جائیں گے

بشر با وصفِ تسخیرِ فلک پیوندِ خاک اب تک
مگر یارب ! مہ و خورشید و انجم تابناک اب تک
نسیمِ صبح اِس نازِ شگفتِ گُل سے کیا حاصل؟
ہزاروں پھول محرومِ نمو ہیں زیرِ خاک اب تک
بہت قاتل ہے زہرِ تاک لیکن کیا علاج اِس کا
کہ اکسیرِ غمِ آفاق ہے یہ زہرِ تاک اب تک
ظہورِ عہدِ نو برحق مگر یہ کیا قیامت ہے
شفق ہے خونچکاں ابتک سحر ہے سینہ چاک اب تک
نجانے کتنے ساماں ہو چکے ہیں دِلنوازی کے
نجانے کتنے دل ہیں مرگِ پنہاں سے ہلاک اب تک
دیارِ جاں سے سیلِ غم فقط اِک بار گذرا تھا
مگر اِس تجربے سے زندگی ہے سہم ناک اب تک
رئیس اُن کی جُدائی کو زمانہ ہوگیا لیکن
فضا میں گونجتی ہے اِک صدائے دردناک اب تک

قافلے جن کی ہدایت پہ رَواں ہوتے ہیں
کسی گمراہ کے قدموں کے نشاں ہوتے ہیں
دلِ وارفتہ! شبِ غم میں کوئی خواب ہی دیکھ
خواب بھی مایۂ بیداریِ جاں ہوتے ہیں
نَفَسِ گرمِ عنادل کی حقیقت معلوم
پھُول ہیجانِ تجلّی سے جواں ہوتے ہیں
کس کو معلوم اُن اَشکوں کی حقیقت اے دوست!
رُوح کی سمت جو آنکھوں سے رواں ہوتے ہیں
دل پہ یوں چھوڑ گیا سیلِ بلا اپنے نقوش
جس طرح ریت پہ لہروں کے نشاں ہوتے ہیں
گاہے گاہے ترے کوچے سے گذرنے والے!
رہ نمایانِ جہانِ گذراں ہوتے ہیں
شرح و تفصیل سے لکھتی ہے جنھیں عقل رَئیس
عشق ہی کے وہ اشاراتِ نہاں ہوتے ہیں

فضائے بحر پہ گہرا سکوت طاری ہے!
یہ کس تلاطمِ پنہاں کی پردہ داری ہے
اِدھر غرور اُدھر نازِ خاکساری ہے
یہ کھیل کتنے تکلّف کے ساتھ جاری ہے
جنوں نے تا بہ دَرِ دوست رہ نمائی کی!
یہ بزمِ خاص ہے اب آگہی کی باری ہے
زوالِ گُل کا نہ غم کھا کہ قلب غنچہ پر
نئی بہار کا الہام راز طاری ہے
ابھی نئی سحروں کا نہ انتظار کرو
ابھی نئے افقوں کی تلاش جاری ہے
ہر ایک ساز کی قِسمت ہے سحرِ نغمہ زنیں
مگر وہ چیز کہ مطرب کی سحر کاری ہے؟

ہزار رنگ کے جلووں میں گھر گیا ہوں میں
یہ کس عذابِ تماشا میں مبتلا ہوں میں؟
حدودِ مطرب و محفل سے ماورا ہوں میں
جو گونجتی ہے پہاڑوں میں وہ صدا ہوں میں
مرے قریب نہ آ اے بہشتِ بے خبری!
خود آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں
یہ بے حساب دُھندلکے یہ بے شمار نجوم
خرابِ ظلمت و آزردۂ ضیا ہوں میں
رہِ طلب میں مرے پیش رَو جو چھوڑ گئے
برہنہ پا انھیں کانٹوں پہ چل رہا ہوں میں
اگرچہ خود سرِ راہِ طلب ہوں اُفتادہ
کسی عظیم مسافر کا راستا ہوں میں
فروغِ صبح سے کہہ دو کہ انتظار کرے
چراغِ شام کے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

عشق کو باز نہ رکھ شکوہ سرا ہونے سے
نغمہ مرجاتا ہے محرومِ صدا ہونے سے
ہر تجلّی سے گذرتی چلی جاتی ہے نگاہ
کوئی وعدہ ابھی باقی ہے وفا ہونے سے
روحِ نغمہ اجلِ نغمہ ہے پابندیٔ نے
نالہ بن جا کسی مطرب کی نوا ہونے سے
گوشِ غنچہ میں دمِ صبح یہ کہتی تھی نسیم
زندگی اور نکھرتی ہے فنا ہونے سے
دل کو اب تیری توجّہ کا یقیں آیا ہے
وہ بھی کچھ تیرے تغافل کے سوا ہونے سے
کفر بن کر مری ہستی میں سمٹ آیا ہے
وہی سجدہ کہ جھجکتا تھا ادا ہونے سے
رہروِ شوق کو ہوتا نہیں اندازۂ راہ
ہاں! مگر تجربۂ لغزشِ پا ہونے سے

کب نغمۂ شوق اہلِ تمنّا کے لیے ہے
یہ گیت کسی مطربِ فردا کے لیے ہے
تو کس کے لیے زندہ و پائندہ ہے اے دل
قطرے کی بقا عظمتِ دریا کے لیے ہے
کیوں شاخِ تمنّا پہ شگفتہ نہیں ہوتا
وہ گُل جو خمِ طرّۂ لیلیٰ کے لیے ہے
اے قافلۂ شوق! درِ جاں پہ ٹھہر جا
یہ راہ کسی رہروِ تنہا کے لیے ہے
ذکرِ غمِ جاناں میں بسر ہوتا ہے افسوس
وہ وقت کہ فکرِ غمِ دُنیا کے لیے ہے
اک ذوق تجسّس ہے کہ قانع نہیں ہوتا
ورنہ یہی انساں اِسی دنیا کے لیے ہے
اے صحن چمن! رونقِ گُل تجھکو مبارک
ساماں بہت آرائشِ صحرا کے لیے ہے

تقلیدِ خضر سے نہ مجھے راستا ملا
میں خود ہی بڑھ کے قافلے والوں سے جا ملا
وہ بھی نہ میرے سوزِ دروں کو سمجھ سکے
اک عمر جن کے ساتھ رہا میں گھُلا ملا
ہر شخص نے کسی نہ کسی سے نباہ دی
ہم کو تو دہر میں نہ کوئی بے وفا ملا
ہم اپنا حق کسی سے بہ قوت نہ لے سکے
جو کچھ یہاں ملا بہ طریقِ عطا ملا
جب بھی ملے ہم اُس سے کنارہ کشی کے بعد
ظالم کسی خیال میں ڈوبا ہوا ملا
سنتے تھے ہم کہ عشق ہے اک حُسنِ اتفاق
دیکھا تو واقعات کا اک سلسلہ ملا
جو اوّلِ قدم پہ ہوئے کامیابِ شوق
اے عشق! اُن کو منزلِ آخر میں کیا ملا

کل رات چھڑ گیا تھا دلِ مبتلا کا ذکر
محسوس یہ ہوا کوئی بچھڑا ہوا ملا
بخشی گئی حیاتِ اجل آشنا رئیسؔ
آبِ حیات زہر ملایا ہوا ملا

ہر گام پہ سجدہ کر اے لغزشِ مستانہ
مستی میں بھی واجب ہیں آدابِ صنم خانہ
اُن مست نگاہوں نے چھیڑا ہے پھر افسانہ
کچھ تُو بھی جسارت کر اے جرأتِ رندانہ
یہ شمع کی محتاجی توہینِ محبّت ہے
جلنا ہے تو خود جل جا اے ہمّتِ پروانہ
ہر روز نئے کعبے بن بن کے بگڑتے ہیں
جاری ہے رئیسؔ اب تک تعمیرِ صنم خانہ

عشق رجعت ہے کہ اقدام ہے معلوم نہیں
یا فقط اک روشِ عام ہے معلوم نہیں
موت ہے دفترِ ہستی کا ضمیمہ لیکن
یہ وضاحت ہے کہ ابہام ہے معلوم نہیں
نغمہ پرداز تو نغمے کو جگا دیتا ہے
نغمۂ ساز کا کیا کام ہے معلوم نہیں
ہے مرے عالمِ افکار پہ غالب کوئی شخص
مگر اُس شخص کا کیا نام ہے معلوم نہیں
غمِ ہستی ہے کسی جرم ہزیمت کی سزا
یا کسی فتح کا انعام ہے معلوم نہیں
یہ حقیقت کی تجلّی ہے مری نظروں میں؟
یا فقط سایۂ اوہام ہے معلوم نہیں
دل میں اِک طائرِ زخمی کہ پھڑکتا ہے رہین
پَر کُشا ہے کہ تہِ دام ہے معلوم نہیں

اُن سے گو بول چال بند نہیں
پھر بھی شکوے ہمیں پسند نہیں
عِشق کو اعتدال لازم ہے
زندگی انتہا پسند نہیں
دیر و کعبہ کے نازبردارو!
ہم کسی کے نیاز مند نہیں
ہم خراباتیوں پہ ہیں پہرے
شیخ کا کوئی کام بند نہیں
ہے وہی شاخِ آشیاں اپنی
اِس چمن میں جو سربلند نہیں

کہہ گئی آہستہ آہستہ یہ کیا موجِ نسیم
ہر کلی گویا لبِ گفتار ہوکر رہ گئی

تو عبث عُذر خواہ ہے پیارے
عشق میرا گناہ ہے پیارے
دو دلوں کی تباہیوں پہ نہ رو
ساری دنیا تباہ ہے پیارے
آدمی گر بنا نہ لے محکوم
آدمی بادشاہ ہے پیارے
تیری زلفوں کے پیچ و خم میں کہیں
میرا بختِ سیاہ ہے پیارے
عشق سے دلبری کی داد نہ چاہ
عشق خود داد خواہ ہے پیارے
عِشق پہلی نظر کا نام نہیں!
تو بہت کم نگاہ ہے پیارے
دل ہی خانہ خرابیوں کا سبب
دل ہی جائے پناہ ہے پیارے
طعنِ رندی نہ کر کہ تیرا رئیسؔ
عارفِ حق پناہ ہے پیارے

ہجومِ غم سے مَفَر کا خیال کیوں آیا
یہ سوچتا ہوں سفر کا خیال کیوں آیا
اثر کے بعد دعا کا خیال کیوں ہوگا؟
دعا کے بعد اثر کا خیال کیوں آیا
بہت دنوں سے قدم بھی جدھر نہ اُٹھے تھے
بہت دنوں میں اُدھر کا خیال کیوں آیا
ترے بغیر ہر اک انجمن ہے ویرانہ
ترے بغیر سفر کا خیال کیوں آیا
ابھی تو شہر میں قحطِ شرابِ ناب نہیں
کسی کی مست نظر کا خیال کیوں آیا
یہ کیا ہوا کہ نسیمِ سحر نہیں آئی
فقط نسیمِ سحر کا خیال کیوں آیا
کمالِ عظمتِ حق کا خیال کیا کم تھا
زوالِ نوعِ بشر کا خیال کیوں آیا

کتنے جذبات نمایاں نہیں ہونے پاتے
اشک بن جاتے ہیں طوفاں نہیں ہونے پاتے
ہم جو اے صرصرِ غم! تجھ سے اُلجھ جاتے ہیں
گیسوئے دوست پریشاں نہیں ہونے پاتے
کتنے غنچے ہیں کہ بن جاتے ہیں تقدیرِ بہار
کتنے گُل ہیں کہ گُلستاں نہیں ہونے پاتے
ہائے یہ رابطۂ خاص کہ اِک شخص سے ہم
لاکھ بچتے ہیں گریزاں نہیں ہونے پاتے
گرد بن کر مرے دامن سے لپٹ جاتے ہیں
وہ بیاباں کہ بیاباں نہیں ہونے پاتے
لُطف ان کا ہے فقط سوختہ سامانوں پر
اور ہم سوختہ ساماں نہیں ہونے پاتے

اُن کے دل میں بھی آگ بھڑکاؤ
اے مری مشتعل تمنّاؤ
راہِ ہستی ہے سخت پُرآشوب
اور میرے قریب آجاؤ
دوستوں کے فریب آساں ہیں
دوستی کے فریب مت کھاؤ
ردِّ غم کا بدل خوشی تو نہیں
زہر دیتے ہیں زہر پی جاؤ
صُبحِ نو کی تلاش ہے مجھ کو
اے دھندلکو! مرے قریب آؤ
اے حیاتِ فراق کے لمحو!
اُن کی یاد آئی تم نہ یاد آؤ
جَورِ گردوں ہمیں مٹا نہ سکا
تم ہی تکلیفِ ناز فرماؤ

زہے ناخنِ غم کی سینہ خراشی کہ قلب وجگر ہوگئے پارا پارا
ہوئے اپنے ناوک سے ہم آپ زخمی تمہاری نگاہوں نے کیا تیر مارا؟
اگرچہ خرد نے بہت کھیل کھیلے اگرچہ جنوں نے بہت زور مارا
مگر یہ طلسمِ مشیّت نہ ٹوٹا ازل سے یہی تجربہ ہے ہمارا
وہ کب کے گئے بھی مگر دل کو اب تک نہیں ترکِ شوق وتمنا گوارا
جہاں کوئی آہٹ ہوئی میں یہ سمجھا کہ جیسے وہی آرہے ہیں دوبارا
اگرچہ محبّت نے اب تک کسی کی نہ دُنیا بنائی نہ دیں کو سنوارا
خدا کی قسم پھر بھی ترکِ محبّت نہ اُن کو گوارا نہ ہم کو گوارا
ہر اک منزلِ نشو وبالیدگی میں یہ کیوں خار وگُل کی نگہباں ہے فطرت
اگر پردۂ رنگ وبو میں نہیں ہے کوئی جلوہ گستر کوئی حجلہ آرا
کوئی لاکھ عزلت نشیں ہو جہاں میں حوادث سے ممکن نہیں رستگاری
بھلا موجِ طوفاں سے کیا بچ سکے گا کوئی لاکھ ساحل سے کرلے کنارا
دو عالم سے پیہم صف آرا رہوں گا کہ ہے میرا مقسوم زور آزمائی
ہزیمت کا اپنی مجھے غم نہیں ہے حوادث سے لڑ کر حوادث سے ہارا

کوئی یہ حوادث کو پیغام دے دے ابھی میرے دل میں تمنّا ہے باقی
کوئی بادِ صرصر سے جاکر یہ کہدے مری خاک میں ہے ابھی اِک شرارا
بہارِ چمن کروٹیں لے رہی ہے خزاں کی غم انگیز ویرانیوں میں
شبِ غم کی ظلمت پتا دے رہی ہے رئیسؔ اپنی قسمت کا چمکا ستارا

عرضِ غم کا مزا نہیں ملتا
ہم زباں، دوسرا نہیں ملتا
کس کی زلفوں کو چھو کے آئی ہے؟
کیوں مزاجِ صبا نہیں ملتا؟
آدمی کی تلاش میں ہے خدا
آدمی کو خدا نہیں ملتا
مدّعی کا حصول آساں ہے
حاصلِ مدّعا نہیں ملتا

عشق بے پرہیز ہے یوں ہی سہی
حُسن کم آمیز ہے یوں ہی سہی
زندگی خونریز ہے یوں ہی سہی
وقت تیغِ تیز ہے یوں ہی سہی
ہم نشاط اندوز ہیں؟ ہوں گے ضرور
مے نشاط انگیز ہے؟ یوں ہی سہی
موت ہے بے حاصلی پر مطمئن
کشتِ جاں زرخیز ہے یوں ہی سہی
ناصحِ ناداں! کسی کا التفات
شہدِ زہر آمیز ہے یوں ہی سہی
جانِ شیریں کے لیے فرہاد بھی
خسروِ پرویز ہے یوں ہی سہی
روح پر یلغارِ آگاہی رئیسؔ
حملۂ چنگیز ہے یوں ہی سہی

دل کو احساس کی شدّت نے کہیں کا نہ رکھا
خود محبّت کو محبّت نے کہیں کا نہ رکھا

بوئے گل! اب تجھے احساس ہوا بھی کہ تجھے
تیری آوارہ طبیعت نے کہیں کا نہ رکھا

تم کو ہر شخص سے ہے چشمِ مروّت کی اُمیّد
تم کو اِس چشمِ مروّت نے کہیں کا نہ رکھا

دلِ دانا ہمہ خوں دیدۂ بینا ہمہ اشک
دیدہ و دل کی لطافت نے کہیں کا نہ رکھا

نگہ شوق کسی شے پہ ٹھہرتی ہی نہیں
اِس بصارت کو بصیرت نے کہیں کا نہ رکھا

پہلے یہ شکر کہ ہم حدِّ ادب سے نہ بڑھے
اب یہ شکوہ کہ شرافت نے کہیں کا نہ رکھا

مُجملاً ہے یہ مرا ماحصلِ زیست رئیسؔ
خس کو طوفاں کی رفاقت نے کہیں کا نہ رکھا

یا رب! غمِ عشق کیا بلا ہے؟
ہر شخص کا تجربہ نیا ہے
اب آپ کی آنکھ میں ہیں آنسو
سیلاب کا رُخ بدل گیا ہے
کم ذوق ہیں طالبانِ نغمہ
مطرب کا سکوت بھی صَدا ہے
شاید اُسے عشق بھی نہ سمجھے
جس کرب میں عقل مبتلا ہے
میں اور شکایتِ زمانہ!
اِک شخص کا ذکر چھڑ گیا ہے
یہ زد پہ ہے کون مرغِ وحشی؟
صیّاد کا دل دھڑک رہا ہے
قانع ہوں رئیس دُردِ مے پر
یاروں کی بساط اور کیا ہے؟

میں اور سجدہ کسی سنگِ آستاں کے لیے؟
اگر زمیں پہ جھکوں گا تو آسماں کے لیے

بیاں نہیں فقط آرائشِ بیاں کے لیے
زبانِ حال ضروری ہے ہر زباں کے لیے

وہیں وہیں ترے عارض پہ ہے لطافتِ رنگ
نگاہِ شوق نے بوسے جہاں جہاں کے لیے

فقط ندامتِ افشائے راز ہی تو نہیں
ہزار طرح کے خطرے ہیں رازداں کے لیے

شمیمِ گُل! یہ سفر کس کو راس آیا ہے
یہ تُو نشیمنِ گُل سے چلی کہاں کے لیے؟

کبھی کبھی تو مکمّل سکوت لازم ہے
معاملاتِ محبّت کے ترجماں کے لیے

سُنو کہ روح سے اُٹھی ہے اک صدائے سکوت
کہو کہ نطق ضروری نہیں بیاں کے لیے

فغاں کہ مطربِ نغمہ سرا کے بس میں نہیں
وہ طرزِ خاص کہ مخصوص ہے فغاں کے لیے
کیے ہیں صَرف بہاروں نے غنچہ و گل یُوں
کہاں کہاں کے اشارے کہاں کہاں کے لیے
یہ کام ہم سے نہ لے اے سبک سری ہم سے
کہ سرگراں ہوں کسی یارِ سرگراں کے لیے
زبانِ شوق نے کتنے لغت بنا ڈالے
بس ایک لفظِ محبّت کی داستاں کے لیے
نجانے کب سے مرا دل وجودِ قطرہ میں
دھڑک رہا ہے کسی بحرِ بیکراں کے لیے
کہاں سے لائیں نئی رونقیں نئے جلوے
رئیس صُبحِ بہار و شبِ خزاں کے لیے

بہار ہو کہ خزاں تازگی نہیں ملتی
چمن میں جدّتِ افکار ہی نہیں ملتی
شروعِ عشق میں شُعلہ سا اِک بھڑکتا ہے
پھر اُس کے بعد کہیں روشنی نہیں ملتی
ہر ایک شب پہ گمانِ شبِ فراق نہ کر
ہر ایک شب کو یہاں تیرگی نہیں ملتی
میں جب سے منصبِ آشفتگی پہ فائز ہوں
صَبا کو خدمتِ آوارگی نہیں ملتی
شعورِ عشق کو بازیچۂ جنوں نہ بنا
جنوں ملے تو ملے آگہی نہیں ملتی
عذابِ وصل بھی مقسومِ عشق ہے کہ اُسے
فقط سزائے غمِ ہجر ہی نہیں ملتی
ہم اہلِ شوق کو اپنی خبر کہاں کہ ہمیں
کبھی کبھی خبرِ دوست بھی نہیں ملتی!

جو سینوں کے دریچے باز ہوں گے
نجانے فاش کیا کیا راز ہوں گے؟
کہیں سرمایۂ انجام ٹھہرے ہم
کہیں پیرایۂ آغاز ہوں گے
ہماری داستانِ زندگی پر!
کئی قصے اثر انداز ہوں گے
کسی جھونکے میں اُڑ جائیں گے وہ بھی
جو محتاجِ پرِ پرواز ہوں گے
یہ آوازیں کبھی مطرب بنیں گی!
یہی مطرب کبھی آواز ہوں گے
جہاں بربط نوازوں پر ہے قدغن
وہاں بربط نوا پرداز ہوں گے
کہاں ہم اختتامِ نغمہ کے بعد
اگر ہوں گے تو صرف آواز ہوں گے

زمیں پر روشنی ہی روشنی ہے
خلا میں اِک کرن گُم ہوگئی ہے
میں تنہا جا رہا ہوں سوئے منزل
یہ پرچھائیں کہاں سے آرہی ہے
یہ شام اور روشنی کی یہ قطاریں
اُداسی اور گہری ہوگئی ہے
عروجِ ماہ ہے اور مقبروں پر!
اَبد کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے
اُبھار اے موجِ طوفاں خیز اِسکو
یہ کشتی ریت میں ڈوبی ہوئی ہے
ہوا سے ہے کلی جُنباں سَرِ شاخ
یہ کن ہاتھوں میں نیزے کی اَنی ہے
گرا ہے شاخِ گل سے ایک پتا
کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے؟

اہلِ وحشت کو شعورِ حدِ وحشت چاہیے
جوش میں اک ہوش بھی حسبِ ضرورت چاہیے
میں وہی محفل ہوں جس محفل کی ہے مجھکو تلاش
میں وہی خلوت ہوں خود مجھ کو جو خلوت چاہیے
جسم کو اک پیکرِ صد رنگ و بو کی ہے تلاش
روح کو اک جلوۂ بے رنگ و صورت چاہیے
اے غرورِ حسن! تیرے شیوہ ہائے ناز سے
لطف اُٹھانے کو بہت نازک طبیعت چاہیے
کچھ مقام ایسے بھی ہیں راہِ اطاعت میں جہاں
ماسوا کیا ہے؟ خدا سے بھی بغاوت چاہیے
زندگی محبوب بھی ہے زندگی معتوب بھی
زندگی کے دونوں جلووں سے محبّت چاہیے
اپنے آغوشِ تہی میں خود سمٹ آیا ہوں میں
ورنہ ہر آغوش کو اِک سَرو قامت چاہیے

جراُتِ انکارِ حق یا ہمّتِ اقرارِ حق!
کچھ نہ کچھ تو اے غرورِ آدمیّت چاہیئے
کام جب نکلے نہ کبر و سرکشی سے اے رئیس
بندۂ مجبور کو صبر و اطاعت چاہیے

گھٹتے ہوئے رفتارِ نفس دیکھ رہے ہیں
کب دیکھیے ٹوٹے یہ قفس دیکھ رہے ہیں
تم لوگ سنا کرتے ہو فریادِ جرس کو
ہم عالمِ فریادِ جرس دیکھ رہے ہیں
اِس سال ہیں کچھ اور ہی قسمت کے اشارے
کچھ رنگ نیا اب کے برس دیکھ رہے ہیں

گماں نہ کر کہ زمانہ کبھی نیا ہوگا
یہی جو ہے یہی ہوگا یہی رہا ہوگا
تو اپنے جلوۂ آوارہ کو تلاش نہ کر
مری نگاہ کے سانچے میں ڈھل گیا ہوگا
صَبا چمن سے نویدِ شگفت لائی ہے
کسی کلی کا جگر خون ہوگیا ہوگا!
ابھی سے عِشق کو یہ شکوۂ تغافلِ حُسن؟
ابھی تو اُس کی توجہ کا سامنا ہوگا
مری طرح شبِ فرقت میں اُسکو نیند کہاں؟
میں سو رہا ہوں تو سوچوں وہ سو رہا ہوگا
یہ نظمِ دہر کی انگڑائیاں یونہی تو نہیں
وہ خوابِ ناز میں کروٹ بدل رہا ہوگا
شکستِ نے ہے قیامت مگر یہ سوچ رئیسؔ
کہ نے نواز پہ کیا کچھ گذر گیا ہوگا

چاند بدلی میں یکایک جو نہاں ہوتا ہے
کسی در پردہ کشاکش کا گماں ہوتا ہے
شدّتِ شوق میں یہ ہوش کہاں ہوتا ہے
دل نہیں ہے تو اب احساسِ زیاں ہوتا ہے
کوئی شعلہ تو نہیں غم کہ بھڑک کر بجھ جائے
یہ اُبھرتا ہے نکھرتا ہے جواں ہوتا ہے
فطرتِ حُسن ہے خود بین و خود آرا ، ورنہ
رنگ بھی گُل کی نزاکت پہ گراں ہوتا ہے
جیسے خود وہ کسی گوشے سے نکل آئیں گے
دل کچھ اِس طرح یکایک نگراں ہوتا ہے
کیوں یہ افکار کی دُنیا میں تلاطم ہے رئیسؔ
کون بیدار پسِ پردۂ جاں ہوتا ہے؟

ساحل سمجھ کے چشمِ طلب جس کو دنگ ہے
اِس بحرِ بیکراں میں وہ اک موجِ رنگ ہے
اللہ رے جوشِ ناز کہ بلبوسِ رنگ و بو
اُس گُل بدن کے قامتِ موزوں پہ تنگ ہے
یہ عقدہ کاوشِ غمِ پنہاں سے حل ہوا
دل اور غم میں نسبتِ فرہاد و سنگ ہے
اُس شہسوارِ ناز کو اب تک خبر نہیں
اک صیدِ نیم کشتہ حریصِ خدنگ ہے
ہر ذرّے سے ہے ولولۂ تازہ آشکار!
یا رب! وہ دل کہاں ہے یہ جس کی امنگ ہے
اُس جان آرزو سے مبارز طلب تھا دل
دیکھا تو اپنے آپ سے مصروفِ جنگ ہے
آؤ! نئی بہار کے خاکے سجائیں ہم!
یہ خار ہے یہ گُل ہے یہ بُو ہے یہ رنگ ہے

کام اِس طرح تو ابتر نہ ہمارے ہوتے
تم نے گیسو اگر اپنے ہی سنوارے ہوتے
رہ گئے اشک مری آنکھ میں موتی بن کر
اُن کے دامن پہ چمکتے تو ستارے ہوتے
شعلۂ حُسن کو کچھ بھا ہی گیا جامۂ رنگ
پھول اگر پھول نہ ہوتے تو شرارے ہوتے
کاش دُنیا کے مصائب کو سمجھنے کے لیے
تم نے کچھ دن مری دنیا میں گزارے ہوتے
بہہ رہے ہیں اَبدی و ازلی دھاروں میں
پاؤں ٹکتے تو کسی ایک کنارے ہوتے
اب کہاں قافلۂ صبح کہاں نکہت و رنگ
ہم بھی اے کاش اُسی وقت سدھارے ہوتے
یہ کشاکش تو بہر حال مقدّر تھی رئیسؔ
تم اگر اُن کے نہ ہوتے وہ تمھارے ہوتے

جب بھی اُن سے لڑائیاں ہوں گی
پیش کیا کیا صفائیاں ہوں گی
عشق ابھی اور رنگ لائے گا
اور ابھی جگ ہنسائیاں ہوں گی
حُسن کی پَردہ داریوں پہ نہ جا
یہ بھی کچھ خود نمائیاں ہوں گی
کِس کا دستِ کرم دراز ہوا؟
کس کی حاجت روائیاں ہوں گی
جو ہماری بُرائیاں ہیں آج!
کل ہماری بھلائیاں ہوں گی
ذرّہ و آفتاب میں کیا میل؟
دور کی آشنائیاں ہوں گی
کل تھا یاروں میں ذکرِ خیر اپنا
کچھ ہماری بُرائیاں ہوں گی

قہر گو شیوۂ محبوب نہیں
پھر بھی کس رنگ میں تو خوب نہیں
کوئی اربابِ وفا سے کہہ دے
شکوہ متروک ہے معیوب نہیں
ہر طلب ننگِ طلب ہے اے دوست
تو اگر مقصد و مطلوب نہیں
جس سے سینے میں نہ بھڑکے کوئی آگ
وہ نفَس عمر میں محسوب نہیں
بندگی کفر سے بدتر ہے اگر
میرے محبوب کو محبوب نہیں
کچھ نہیں حاصلِ مکتوب اے دوست
دل اگر شاملِ مکتوب نہیں

ہوں مزے دار جفائیں تو مزہ آجائے
زہرِ غم خود وہ پلائیں تو مزہ آجائے
جُرم بن جائیں وفائیں تو مزہ آجائے
دیں وہ گِن گِن کے سزائیں تو مزہ آجائے
غیر نے بزم سجائی ہے بڑے دعوے سے
آپ تشریف نہ لائیں تو مزہ آجائے
پہلی ہی بوند پہ توبہ کے قدم کانپ اُٹھے
کُھل کے برسیں یہ گھٹائیں تو مزہ آجائے
آج ہی ہم نے ملاقات کی کھائی ہے قسم
آج ہی وہ بھی بلائیں تو مزہ آجائے

دل میں خوفِ عقبیٰ بھی گاہ گاہ آتا ہے
یہ بزرگ واقف ہیں اس غریب خانے سے

دیدنی ہے بہار کا منظر
زہر چھڑکا گیا درختوں پر
بُن رہے ہیں عروسِ گُل کا کفن
مگس برگ و عنکبوتِ شجر
چیل کوّوں کو تا کتے رہیے
چاند تاروں سے تھک گئی ہے نظر
جو مرا تکیہ جوانی تھا
اُسی برگد کی جُھک گئی ہے کمر
ہاتھ پھیلا کے چیختے ہیں درخت
صرصرِ حادثہ کا رُخ ہے کدھر؟
سرخ پھولوں کے لال انگارے
چشمِ زردِ عقاب کے اخگر
وہ جبینِ شفق پہ خطِّ شعاع
خون سے کس کے سرخ ہے خنجر
اب کے برسات کچھ تو راس آئی
گھاس اُگنے لگی منڈیروں پر

دھوپ اِس صحن میں نہ در آئے
بند کر دو تمام روزنِ در
رقص کرتے ہوئے بگولوں میں!
دیو و جنّات و روح کے لشکر
دیکھتا ہوں کہ کیا دکھاتے ہیں
اپنے سائے پہ جم گئی ہے نظر
عالمِ بے خودی میں گہرا سانس
سینۂ کائنات میں ہے سفر
آپ اپنے سے کیوں گریزاں ہوں
کسی آسیب کا ہے مجھ پہ اثر!
کون میرے لیے ہے شب بیدار؟
کیوں برستے ہیں رات بھر پتھر
میں ہی میں ہوں خلائے تیرہ میں
نہ عُطارد نہ مشتری نہ قمر
تہ بہ تہ ظلمتیں ہیں جنبش میں
رینگتے ہیں سیاہ پوش اژدر

جبل الشمس کی بلندی سے
دیکھتا ہوں زمیں کو جھک جھک کر
ایک پُرنور نیلگوں نقطہ!
کانپتا ہے خلا میں رہ رہ کر
کہکشاں سے شمال کی جانب
وقت کے بے نشان محور پر
نور کے دائرے ہیں گردش میں
آخر اِن قافلوں کا رُخ ہے کدھر؟
کون آخر جھنجھوڑتا ہے مجھے؟
عالمِ خواب میں سرِ بستر؟
کون آخر مجھے جگاتا ہے
آخرِ شب میں روز آ آ کر
نہ شہابہ نہ کوئی طیّارہ
کون یہ زن سے گیا اِدھر سے اُدھر

گردشِ وقت بھی آگے مجھے لے جا نہ سکی
تم جہاں چھوڑ گئے تھے ہیں وہیں ہوں اب تک
رتبۂ بادشہی خاک نشینوں کو ملا
اور میں بادشہ خاک نشیں ہوں اب تک
شبنم و گل ہمہ عریاں۔ مگر اے روحِ نمو!
میں سرِ بزمِ چمن پردہ نشیں ہوں اب تک

ابھی قدرت نہیں مایوس شاید نوعِ انساں سے
ابھی تک ڈوب کر کشتی اُبھر آتی ہے طوفاں سے
کھلیں گے اور بھی گُل تودۂ خارِ مغیلاں سے
جنوں فارغ نہیں آرائشِ کوہ و بیاباں سے

اکثر جہاں کسی سے نہ ملنے کا قصد تھا
اکثر وہیں کسی سے ملاقات ہوگئی
ہم جس پہ اپنا نقشِ قدم چھوڑ کر گئے
وہ خاکِ راہ قبلۂ حاجات ہوگئی
کیا فائدہ گزارشِ حالات سے ہوا
کچھ بھی نہیں گزارشِ حالات ہوگئی

دوست سے ترکِ تعلق کے لیے
رشکِ دشمن کے بہانے ڈھونڈے

یہ کربلا ہے نذرِ بلا ہم ہوئے کہ تم
ناموسِ قافلہ پہ فدا ہم ہوئے کہ تم
کیوں دجلہ و فرات کے دعوے کہ نہر پر
تشنہ دہن شہیدِ جفا ہم ہوئے کہ تم
مانا کہ سب اجل کے مقابل تھے سربکف
لیکن شکارِ تیرِ قضا ہم ہوئے کہ تم
تم بھی فریب خوردہ سہی پر بصد خلوص
مقتولِ مکر و صیدِ دغا ہم ہوئے کہ تم
تم شاخِ گل سے اڑ کے گئے شاخِ گل کی سمت
اپنے نشیمنوں سے جدا ہم ہوئے کہ تم
استادِ صبر و نکتہ شناسِ رضا تھے تم
لیکن قتیلِ صبر و رضا ہم ہوئے کہ تم
سو بار راستے میں لٹا ہے جو کارواں
اُس کارواں کے راہ نما ہم ہوئے کہ تم
پیکانِ نیزہ و رسنِ دار ہے گواہ
سر دے کے سربلندِ وفا ہم ہوئے کہ تم

پیمانِ شوق کس نے نباہا قدم قدم
اور حقِّ عاشقی سے ادا ہم ہوئے کہ تم

تم بھی نثارِ دوست تھے ہم بھی نثارِ دوست
خود فیصلہ کرو کہ فدا ہم ہوئے کہ تم

تم بھی جلوسِ موسمِ گل میں تھے پیش پیش
آوارہ مثلِ بادِ صبا ہم ہوئے کہ تم

تم لاکھ ہم سفر تھے پر انصاف تو کرو
یارو! ہلاکِ لغزشِ پا ہم ہوئے کہ تم

ترا خیال کہ خوابوں میں جس سے ہے خوشبو
وہ خواب جن میں مرا پیکرِ خیال ہے تو

سُنا رہی ہیں مجھے بچپنے کی کچھ یادیں
وہ گرمیوں کے شب و روز دوپہر کی وہ لُو

پچاس سال کی یادوں کے نقش اور نقشے
وہ کوئی نصف صدی قبل کا زمانہ ہو

وہ گرم و خشک مہینے وہ جیٹھ وہ بیسا کھ
کہ جا فظے میں کبھی آہ ہیں کبھی آنسو

وہ زائیں زائیں کے کتنے مہیب زنّاٹے
فضا کا ہول، ہوا کی وہ وحشتیں ہر سو
وہ سائیں سائیں کے کتنے عجیب سنّاٹے
وہ سنسنی وہ پُراسرار ایک عالمِ ہُو
وہ دوپہر وہ ہبوڑے وہ سینگی باٹی[1] کوٹ
فضائے شعلہ بجان و ہوائے آتش خو
وہ کھڑکیوں میں ہواؤں کی سرکشی تندی
وہ بام و در پہ مسلّط جہنمی جادو
وہ پیچ و تاب بگولوں کا میرے آنگن میں
چڑیلیں گھر میں گھس آئی ہیں کھول کر گیسو
وہ لُو کا زور کہ سارے کواڑ بجتے ہیں
کہ جیسے لشکرِ جنّات کا عمل ہر سو
وہ شور جیسے بگولوں میں بھوت ہوں رقصاں
وہ قاہ قاہ وہ ہاہا وہ ہُونک وہ ہُو ہُو!
گزر رہا ہے تصوّر سے جیٹھ کا موسم
اور اس سمے میں مجھے یاد آ رہا ہے تو

---

۱ ماضی بعید کے جرائم پیشہ قبیلے، جن سے بچوں کو ڈرایا جاتا تھا۔

# رومانیات

# بہ عہدِ جوانی چنانکہ افتد و دانی

جس پہ تہمت تھی ہمیشہ سے دل آزاری کی
اس کو سینے سے لگایا تو ہمہ دل پایا

(داستان عہدِ شباب)

# عشق

عقل فانی ! ارتقائے نوع انسانی ہے عشق
مادی دنیا کو اک پیغامِ روحانی ہے عشق
آج بھی جب عقل پر ہے جہد ہستی کا مدار
آج بھی جب زندگی ہے اک مشینی کاروبار
آج بھی جب سوزِ باطن کا نہیں ملتا سراغ
آج بھی جب دل کے ہنگاموں پہ غالب ہے دماغ
آج بھی جب منزلِ انسانیت کچھ اور ہے
راکٹوں کا عہد ہے اسپٹنکوں کا دور ہے
آج بھی جب پیکر خاکی خلا پرواز ہے
آج بھی جب کائناتی دور کا آغاز ہے
آج بھی ہر کاروانِ دل رواں ہے سوئے دوست
آج بھی امید گاہِ عاشقاں ہے کوئے دوست

یادِ یارِ دل ستاں آنے لگی
ساعتِ تسلیمِ جاں آنے لگی
پھر چمن سے ربط پیدا ہوگیا
پھر ہوائے گلستاں آنے لگی
حبّذا اے کاروانِ بوئے گل
نکہتِ زلفِ بتاں آنے لگی
مرحبا اے قاصدِ عہدِ بہار
یادِ بزمِ دوستاں آنے لگی
دل میں کوئی چٹکیاں لینے لگا
لب پہ کوئی داستاں آنے لگی
دردِ بے درماں مزہ دینے لگا
لذّتِ زخمِ نہاں آنے لگی
پھر کوئی دل کے قریں ہونے لگا
پھر دلِ مُردہ میں جاں آنے لگی

ضبطِ غم کی کوششیں غارت ہوئیں
حسرتِ دل بر زباں آنے لگی
بچ کے طوفانوں سے ساحل کی طرف
کشتیٔ عمرِ رواں آنے لگی
پھر جنوں کی پیشوائی کے لیے
اُڑ کے گردِ کارواں آنے لگی
کون ہے یہ کعبۂ جاں میں مقیم؟
دل سے آوازِ اذاں آنے لگی
کون ہے محوِ سماعت اے ندیم!
عشق کو طرزِ فغاں آنے لگی
پھر بصد شوخی غزل خواں ہے رئیس
دل کو دلبر کی زباں آنے لگی!

# نذرِ عقیدت

حیراں ہوں کہ اُس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں!
لو آج دعائے نیم شبی پیغامِ مسرّت لائی ہے
اُمید کی نازک سی بدلی خوابوں کے اُفق پر چھائی ہے
اُس محوِ تغافل کو اے دل! مدّت میں مری یاد آئی ہے
کافر نے کوئی رنگین سی شے تحفے میں طلب فرمائی ہے
تاکید یہ ہے جس طرح بنے نذرانۂ خدمت پیش کروں
حیراں ہوں کہ اُس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں

ظاہر ہے کہ اس کو چاہ نہیں دولت کے حسیں سامانوں کی
دنیا کی جمیل آرائش کی عشرت کے نفیس ایوانوں کی
عزّت نہیں اُس کی نظروں میں ہنگامہ پسند انسانوں کی
وہ حلم و سکوں کی دیوی ہے اِس بستی میں دیوانوں کی
اُس پیکرِ خوبی کے آگے کیا حُسن و لطافت پیش کروں
حیراں ہوں کہ اُس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں

کہنے کو تو کہہ دوں گردوں سے انجم کی ضیائیں لاؤں گا
طوفانوں سے موتی رولوں گا صحرا سے فضائیں لاؤں گا
حوروں سے کرشمے مانگوں گا پریوں سے ادائیں لاؤں گا
شاعر سے تخیل مانگوں گا مطرب سے صدائیں لاؤں گا
اے کاش کہ اس سے بھی بڑھ کر نذرانۂ الفت پیش کروں
حیراں ہوں کہ اس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں
پھولوں کا وہاں رتبہ ہی نہیں وہ پھول سا پیکر کافی ہے
خوشبو کی اُسے پروا ہی نہیں گیسوئے معنبر کافی ہے
آئینہ کبھی دیکھا ہی نہیں وہ عارض انور کافی ہے
زیور تو پسند آیا ہی نہیں خود ناز کا زیور کافی ہے
اِن میں سے کوئی تحفہ کیوں کر ہنگامِ ارادت پیش کروں
حیراں ہوں کہ اِس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں؟

اُس سحرِ مجسّم کے آگے جادو میں کوئی اعجاز نہیں
اُس نورِ جہاں کے قدموں پر دولت کا کوئی اعزاز نہیں
محتاج کسی دیوانے کی وہ لیلیٰ بزمِ ناز نہیں
گو میں ہوں مغنّیِ قدرت کا بربط میں مرے آواز نہیں
اِس بربطِ بے آواز کو کیا اے مطربِ قدرت پیش کروں
حیراں ہوں کہ اس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں
عشرت کے نظارے کافی ہیں آغوشِ طرب کے پالوں کو
فرصت ہی نہیں نظاروں کی ہم ایسے شکستہ حالوں کو
بہروپ بدلنے دو لاکھوں ہنگامہ طلب نقّالوں کو
آسان نہیں مائل کرنا اِن شوخ جوانی والوں کو
اُلفت کا کوئی معیار نہیں کیا تحفۂ الفت پیش کروں؟
حیراں ہوں کہ اُس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں؟

واقف نہیں اپنی عظمت سے وہ ملکۂ عالی جاہ ابھی
معصُوم جوانی کا جادو فتنوں سے نہیں آگاہ ابھی
چاہے تو زمیں پر سجدہ کریں جُھک جُھک کے یہ مہر و ماہ ابھی
معمور ہو اُس کے جلووں سے فطرت کی تجلّی گاہ ابھی
میں ایک تہی دامن شاعر کیا ہدیۂ عظمت پیش کروں؟
حیراں ہوں کہ اُس کی خدمت میں کیا نذرِ عقیدت پیش کروں؟
سُنتا ہوں کہ اُس کے پہلو میں اک درد رسیدہ سا دل ہے
یعنی وہ کماں ابرو والا خود تیر سے اپنے گھائل ہے
یہ سچ ہے تو میرے پاس بھی اک تحفہ ہے جو اسکے قابل ہے
اس تحفۂ بے قیمت پہ اگر مائل ہو تو پھر کیا مشکل ہے
یا قلبِ شکستہ نذر کروں یا اشکِ محبّت پیش کروں؟
کافی ہے گر اُس کی خدمت میں یہ نذرِ عقیدت پیش کروں؟

تو ہو جو وطن کی سمت راہی!
اے موجِ نسیمِ صبح گاہی!
اُس جانِ وطن سے جا کے کہنا
اے آیۂ رحمتِ الٰہی!
اک طالبِ شیوۂ کرم سے
کب تک یہ ادائے کم نگاہی
انصاف ہے شرط فیصلہ کر
دوری ترے در سے کس نے چاہی
کیا خود میں بچھڑ گیا ہوں تجھ سے؟
کافی ہے نصیب کی گواہی!
وہ سر کہ ہے عظمتِ سخن سے
شایانِ غرورِ کج کلاہی!
کیا آپ ہی آپ ہو گیا ہے
پامالِ حوادث و تباہی
جانی! تجھے جس نے بخش دی تھی
معمورۂ جاں کی بادشاہی
وہ دل ترے ہجر پر ہو راضی
شاعر سے یہ بے دلی الٰہی!

# مکتوبِ تمنّا

چُن رہا ہوں تری خاطر چمنِ شوق کے پھُول
اے حسینہ! مرا آدابِ محبّت ہو قبُول
جانِ شاعر! ترے مکتوبِ تمنّا کی قسم
دل کا کچھ اور ہی عالم ہے خلافِ معمول
مجھ سے پوُچھے کوئی بیتابیِ فرقت کے رموز
تجھ سے سیکھے کوئی تسکینِ محبّت کے اصُول
قاصدِ ناز نے مدّت میں جو پہنچایا تھا
شوقِ بیتاب نے اُس خط کو کیا بڑھ کے وصُول
ہائے یہ طرزِ تخاطب کہ لکھا ہے مجھ کو
دل کی دنیا کے خدا مشربِ اُلفت کے رسول!
ہائے کس طنز سے تحریر کیا ہے تو نے
ایک شاعر! روشِ مہر و وفا کیا جانے

اپنے ہی حالِ پریشاں سے نہ فرصت ہو جسے
غیر کے حالِ پریشاں کو بھلا کیا جانے
اک سخن سنج، بجز فکرِ سخن کیا سوچے؟
اک اداکار بجز حُسنِ ادا کیا جانے
جانِ من ! تجھ کو ڈرایا ہے کسی وہمی نے
کھو دیا آہ محبّت کی غلط فہمی نے
اے حسینہ! یہ محبّت ہے وہ زندہ جادو
کہ ہر اک نقش کو جاوید بنا دیتی ہے
بادشاہوں کو جھکاتی ہے غریبوں کے حضور
تاجداروں کو غریبوں سے لڑا دیتی ہے
قلبِ شعلہ سے بہاتی ہے کبھی چشمۂ شیر
رُوحِ قطرہ میں کبھی آگ لگا دیتی ہے
روح بے رنگ ہے زخموں کی حکایت کے بغیر
ورقِ سادہ ہے دل داغِ محبت کے بغیر
رُوپ دنیا میں محبّت کے جداگانہ ہیں
کبھی تسخیرِ انا ہے کبھی عرفانِ شباب
کبھی انساں کو بتاتی ہے تفکّر کے نکات
کبھی شاعر کو سکھاتی ہے جنوں کے آداب

سازِ ایثار و صداقت کا یہی ہے نغمہ
نغمۂ عزم و شجاعت کو یہی ہے مضراب
موڑ دیتی ہے یہ آوارہ تخیّل کی عنان
چھیڑ دیتی ہے یہ خوابیدہ تصوّر کا رباب
روحِ مُردہ کو محبّت ہیں عطا ہوتا ہے
ذوق و شوق و خلش و سوز و گداز و تب و تاب
حُسن خود بیں! ترے وجدان و بصیرت کی قسم
میں محبّت ہی محبّت ہوں محبت کی قسم

ہر طرف خنجرِ قاتل تو نظر آتا ہے
کون مقتل میں تپاں ہے؟ یہ مجھے کیا معلُوم

# ارضِ افسون و افسانہ

چل اے دل! سوئے شہرِ جانانہ چل
بصد شب روی ہائے مستانہ چل
یہی ہے تمنائے خواب و خمار
سوئے ارضِ افسون و افسانہ چل
یہی ہے تقاضائے شعر و شباب
سوئے خاکِ مہتاب و مے خانہ چل
بہ تعمیلِ منشورِ مے خانہ اُٹھ
بہ تجدیدِ پیمانِ پیمانہ چل
مبارز طلب ہیں حوادث تو کیا؟
رجز چھیڑ کر رزم خواہانہ چل
مصائب ہیں ہنگامہ آرا تو ہوں
عَلَم کھول کر فتح مندانہ چل

جو مقصودِ خاطر ہے تنہا روی
تو آزاد و تنہا و بیگانہ چل
جو تنہا روی کا سلیقہ نہ ہو
تو انجان راہوں میں تنہا نہ چل
اٹھا دلق و کشکول و کاسہ اٹھا
قلندر صفت چل فقیرانہ چل
دَف و چنگ وطاؤس وطنبورونے
بہ قانون شہرود وشاہانہ چل
شتربانِ لیلیٰ کو زحمت نہ دے
رہِ شوق میں بے حجابانہ چل
ابھی منزلیں منزلوں تک نہیں
ابھی دُور ہے شہرِ جانانہ چل
ابھی حُسن کی خیمہ گاہیں کہاں
ابھی اور ویرانہ ویرانہ چل
ابھی شہرِ جاناں کی راہیں کہاں
ابھی اور بیگانہ بیگانہ چل
جَبل در جَبل، دشت در دشت ابھی
جواں مردِ کُہسار ! مردانہ چل

وہ بنتِ قبیلہ نہ ہو منتظر
ذرا تیز اے عزمِ مردانہ! چل
وہ سلمائے صحرا نہ ہو مضطرب
رہِ دوست میں عُذر خواہانہ چل
حریفوں کی چالوں سے غافل نہ ہو
کٹھن وادیوں میں حریفانہ چل
غزالوں کی آبادیاں ہیں قریب
غزل خوانیاں کر غزالانہ چل
بہت اجنبیّت ہے اِس شہر میں
چل اے دل! سوئے شہرِ جانانہ چل

# خیر مقدم

بہارِ گل و یاسمن آ رہی ہے
سنا ہے کہ عذرا وطن آ رہی ہے
نئی زندگی ہے فضائے وطن میں
نئی تازگی ہے ہوائے چمن میں
نئی دلکشی ہے مذاقِ سخن میں
یہی تذکرہ ہے ہر اک انجمن میں
کہ وہ رونقِ انجمن آ رہی ہے
سُنا ہے کہ عذرا وطن آ رہی ہے

عنادل سے کہہ دو کہ بربط اٹھائیں
ترانہ کوئی خیر مقدم کا گائیں
ہوائیں نہ شوخی سے گلشن میں جائیں
گلوں کو ذرا حکم دو مسکرائیں

کہ وہ نوبہارِ چمن آرہی ہے
سُنا ہے کہ عذرا وطن آرہی ہے

عجب شان سے آرہی ہے سواری
جِلو میں گُل افشاں ہے بادِ بہاری
نگاہوں پہ کیوں بیخودی ہو نہ طاری
نظر نیچی نیچی ادا پیاری پیاری

وہ نوخیز و نازک بدن آرہی ہے
سنا ہے کہ عذرا وطن آرہی ہے

کوئی اُس کی شانِ نزاکت تو دیکھے
غرورِ جمال و وجاہت تو دیکھے!
کوئی اُس کا اندازِ قامت تو دیکھے
کوئی یہ مجسّم قیامت تو دیکھے

بصد فرّ و افسون و فن آ رہی ہے
سُنا ہے کہ عذرا وطن آ رہی ہے

نگاہوں سے کہہ دو کہ آنکھیں بچھائیں
امنگوں سے کہہ دو کہ گھر کو سجائیں
ربابِ مسرّت کو مطرب بجائیں
رئیسؔ آپ کوئی غزل گنگنائیں

کہ وہ قدر دانِ سخن آ رہی ہے
سُنا ہے کہ عذرا وطن آ رہی ہے

# اے شمعِ شبستانِ جمال!

جھلملانے لگے گردوں پہ ستاروں کے چراغ
آمرے چاند! کہیں تجھ کو درخشاں کردوں
رات تاریک ہے اے شمعِ شبستانِ جمال
تیرے جلووں سے دل و جاں میں چراغاں کردوں
صبحِ صادق ہے ابھی دُور، مناسب ہے یہی
تیرے عارض سے نئی صبح نمایاں کردوں
آج تو وقت کی رفتار کو دے دوں میں شکست
آج تو نظمِ مشیّت کو پشیماں کردوں
گُل سے پہلے ترے رخسار کو دُوں حکمِ شگفت
صبح سے قبل تجھے چاک گریباں کردوں
چوم کر تیرے خد و خال کو اے جانِ بہار
آکہ سرتا بہ قدم تجھ کو گلستاں کردوں

آج تو زمزمہ سنجانِ سحر سے پہلے
میں تجھے زمزمہ پیرا و غزل خواں کر دوں
آج تو صبح بہار و گُلِ تر سے پہلے
صفتِ غنچۂ نورس تجھے خنداں کردوں
آ کہ اِن چمپئی باہنوں کا سہارا لے کر
لشکرِ یاس کو مغلوب و گریزاں کردوں
آ ترے ناوکِ مژگاں کی بلائیں لے کر
سینۂ غم کو ہلاکِ سرِ پیکاں کردوں
آ کہ اِن سرمگیں آنکھوں کی قسم کھا کھا کر
دیدۂ زہرہ و ناہید کو حیراں کردوں
آ کہ اِن شکّریں ہونٹوں کا مزہ لے لے کر
غرقِ صہبائے طربِ تلخیِ دوراں کردوں!
دیکھ پردے سے ہمیں تاک رہی ہے شبنم
گرمیِ شوق سے تجھ کو عرق افشاں کردوں
دیکھ اوپر سے ہمیں جھانک رہے ہیں تارے
تیری افشاں کے ستاروں کو فروزاں کردوں
صُبحِ فرقت سے بدل جائے نہ یہ شامِ وصال
آ کہ رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں کردوں

آ، ذرا، اور قریب اور قریب اور قریب
کہ ذرا اور قوی ربطِ تن و جاں کردوں
تیری مستی میں ابھی ہوش خودی باقی ہے
آ تجھے اور بھی وارفتہ مری جاں کردوں
تیری آنکھوں میں ابھی عکسِ حیا لرزاں ہے
آ تجھے اور بھی شوخ اور بھی نازاں کردوں
دین و دل کا ہے تقاضا کہ ترے قدموں پر
کافرہ! دل ہی نہیں دین بھی قرباں کردوں
میں کہ رضوانِ تمنا ہوں، اجازت ہے کہ آج
تیرے آغوش کو فردوس بداماں کردوں
آکہ بے مہر عزیزوں کو پریشاں کردوں
آکہ بدبخت حریفوں کو پشیماں کردوں

# یہ مہینہ

ساون میں ہے کچھ اور ہی مستی کا قرینہ
ڈر ہے کہیں کافر نہ بنا دے یہ مہینہ
یہ شامِ تمنّا میں کسی عہد کی تکمیل
یہ بسترِ عشرت پہ کوئی شوخ حسینہ
یہ حلقۂ کاکل میں چمکتے ہوئے عارض
یہ چاکِ گریباں سے جھلکتا ہوا سینہ
ہر لمحہ بگڑنے میں سنورنے کا تقاضا
ہر لحظہ سنورنے میں بگڑنے کا قرینہ
اللہ وہ نکہت وہ گُل و غنچہ وہ شبنم
اللہ وہ گیسو وہ لب و رخ وہ پسینہ
بے لفظ سی باتوں میں معانی کا اشارہ
بے ربط سے جملوں میں خموشی کا قرینہ

الفاظ کہ صنعت گریِ شوق کے موتی
سینہ کہ ہم آغوشیِ کامل کا دفینہ
وہ رات وہ برسات وہ جذبات وہ لمحات
وہ وقت وہ ماحول وہ خلوت وہ حسینہ
بڑھتا ہوا طوفانِ ہوس درجہ بدرجہ
چڑھتا ہوا سیلاب طرب زینہ بہ زینہ
دو ہم نفس وہم سخن و ہمدم و ہمراز
وہ رُخ برخ ولب بہ لب وسینہ بہ سینہ
وہ اک بُت خود بین وخود آرا کی پرستش
وہ عالمِ مستی کی عباداتِ شبینہ
کل کیا ہو تو "کل" سے نہ کوئی خوف نہ پروا
یہ "کیوں" ہے تو کیوں سے نہ کوئی بغض نہ کینہ
بہتر ہے اگر ختم وفا ہے یہ ملاقات
اچھا ہے اگر ڈوب رہا ہے یہ سفینہ
یہ دولتِ یک شب مجھے کافی ہے اگر کل
لٹتا ہے تو لٹ جائے دو عالم کا خزینہ

# خلوت نامہ

کامِ جاں، تونے کل اک شخص سے اے دل پایا
جس پہ مائل تھا اسے لطف پہ مائل پایا
دُرِ ناسُفتۂ خوبی گہرِ دُرجِ شباب
تونے اس دولتِ گم گشتہ کا حاصل پایا
شاہدِ حُسن کو جلوہ گرِ خلوت دیکھا
لیلیٔ ناز کو آسودۂ محمل پایا
نہ کوئی قاعدۂ شرم نہ آئینِ حیا
نہ کسی فاصلۂ ناز کو حائل پایا
خلشِ تن کا ہوا راحتِ جاں میں احساس
کربِ لذّت طربِ وصل میں شامل پایا
تونے کل رات تمنّائے ہم آغوشی میں
خود کو مجوبِ ہم آغوشیِ کامل پایا

تو نے اپنے کو سرِ بسترِ آہوئے جمال!
مادۂ شیرِ گرسنہ کے مقابل پایا!
اک حسینہ کو بڑے ناز سے دیکھا برہم
اک غزالہ کو بڑے شوق سے گھائل پایا
خمِ بازو سے جو نکلے تو خمِ گردن میں
کبھی اُن کو کبھی اپنے کو حمائل پایا
سعیِ قربت میں کبھی عشق کو دیکھا دِلریش
زخمِ وصلت سے کبھی یار کو گھائل پایا
اُف وہ پیوستگیِ لعلِ لب و بوسۂ شوق
خضرِ آوارہ نے خود کو سرِ منزل پایا
اُف وہ آویزشِ دست وکمر و سینہ و سر
دوست نے دوست کو یوں مدِّمقابل پایا
اَمنِ آغوش میں شورش وہ ہم آغوشی کی
اک تلاطم سا پسِ دامنِ ساحل پایا

عشرتِ وصل میں وہ کشمکشِ فصل کہ ہائے
ہم نے اِک راحتِ آساں کو بہ مشکل پایا
جس پہ تہمت تھی ہمیشہ سے دل آزاری کی
اُس کو سینے سے لگایا تو ہمہ دل پایا
جس پہ الزام تھا پاکیزگیِ دامن کا
اُس حسینہ کو نچوڑا تو نہ ساحل پایا
ہائے وہ جسم میں اِک پیکرِ نازک کا نفوذ
یعنی اپنے میں کسی شخص کو شامل پایا
ہائے وہ رُوح میں اک جلوۂ عریاں کا حلول
اور اِس طرح کہ خود کو بھی نہ حائل پایا
تو نے اے خوابِ پریشاں! شکنِ بستر میں
چینِ ابروئے حسینہ کو بھی شامل پایا!
تو نے اے شورِ ہوس! برہمیِ جاناں میں
دخلِ جمعیتِ خاطر کو بھی داخل پایا

رنگِ پیراہنِ کافر کی جو سرخی چھوٹی
شفقِ حسن کو نظروں کے مقابل پایا
اُن کے ماتھے پہ جو افشاں کی دھنک سی ٹوٹی
کتنے تاروں کا چراغاں سرِ محفل پایا
اُس ستم پیشہ کی زلفوں کی لٹیں یوں بکھریں
ہم نے اپنے کو گرفتارِ سلاسل پایا
اُس سمن بر کے گریباں کے جو تکمے ٹوٹے
اِن شکستوں کو فتوحات کا حامل پایا
الغرض حسرت و ناکامیِ جاوید کے بعد
کامِ جاں تو نے کل اک شخص سے اے دل پایا

# گستاخ حکایات

ذہن میں محشرِ جذبات لیے پھرتا ہوں
میں تصور میں بس اک رات لیے پھرتا ہوں

ہائے آتی ہوئی گرمی کی وہ تاروں بھری رات
وہ جوانی وہ جوانی کے جواں احساسات
کپکپاتی ہوئی ذہنوں میں کوئی راز کی بات
جانِ آغوش کوئی انجمن آرائے حیات

کتنے رنگین خیالات لیے پھرتا ہوں
میں تصور میں بس اک رات لیے پھرتا ہوں

ہائے وہ رنگ وہ خوشبو وہ امنگیں وہ شباب
تھرتھراتے ہوئے پلکوں پہ امنگوں بھرے خواب
شبنمِ بوسۂ جذبات سے یکسر شاداب
دہنِ تنگ کے غنچے رُخِ رنگیں کے گلاب

لب پہ گستاخ حکایات لیے پھرتا ہوں
میں تصوّر میں بس اک رات لیے پھرتا ہوں

شوخ وہ شوخ کہ دم بھر کو جو ہمدم ہو جائے
خواب میں دولتِ بیدار فراہم ہو جائے
نازِ خوبی کبھی بڑھ جائے کبھی کم ہو جائے
پھول ہاروں کے مسل جائیں تو برہم ہو جائے

دفترِ شکر و شکایات لیے پھرتا ہوں
میں تصور میں بس اک رات لیے پھرتا ہوں

ہائے وہ چاند سا مکھڑا وہ مہکتے گیسو
ہائے وہ قامتِ رعنا وہ کشیدہ ابرو
پیرہن کی وہ لطافت وہ بدن کی خوشبو
ہائے وہ ناز کا فتنہ وہ نظر کا جادو

بارِ سرمستیٔ جذبات لیے پھرتا ہوں
میں تصوّر میں بس اک رات لیے پھرتا ہوں

سُرخ جوڑے میں پُر اسرار سی کوئی بُو باس
جسم پر بارِ لطافت سے وہ ہلکا سا لباس
کوئی آپس میں تکلّف نہ تامّل نہ ہراس
مضمحل عالمِ مستی میں شعور و احساس

کتنے سرشار خیالات لیے پھرتا ہوں
میں تصور میں بس اک رات لیے پھرتا ہوں

کیوں بس اُس رات کے بعد اُس نے بھلا دی ہر بات؟
کیا ہوا! کیوں نہ رہا حُسن کو پاسِ جذبات؟
صرف اک شام جوانی سے عبارت تھی حیات؟
میری تقدیر میں لکھی تھی فقط ایک ہی رات؟

ذہن میں چند سوالات لیے پھرتا ہوں
میں تصوّر میں بس اک رات لیے پھرتا ہوں

# نامۂ شوق

عرُوسِ اُمید و آرزو کو نظر نے پھر بے نقاب پایا
دعائے شب بامُرادِ نکلی جنونِ غم کامیاب پایا
نویدِ حسُن و جمال پہنچی پیامِ شعر و شباب پایا
عروسِ رعنا نگارِ زیبا سلام پہنچا جواب پایا

یہ لُطفِ پرسش ہے درحقیقت حیاتِ نو کا پیام مجھ کو
نَفَس نَفَس کا سلام تجھ پر کہ تو نے بھیجا سلام مجھ کو

سلام تجھ پر کہ تو نے مجھ کو کیا ہے آگاہِ رازِ ہستی
سلام تجھ پر کہ تو نے چھیڑا دلوں کی جنبش سے سازِ ہستی
سلام اے جانِ دلنوازی سلام اے دلنوازِ ہستی
جمال آئنہ دارِ فطرت نگاہ جلوہ طرازِ ہستی

شبابِ معصوم! حسُنِ کافر! دیا وہ رنگیں پیام تو نے
غمِ محبّت کی تلخیوں کو بنایا کیفِ دوام تو نے

جمیل خوابوں کی شاہ زادی! مرا تصوّر جواں نہیں تھا
شباب تھا زندگی نہیں تھی بہار تھی گلستاں نہیں تھا
وفا کا جوہر جنوں کا جذبہ کسی پہ اب تک عیاں نہیں تھا
خلوص تھا دیدہ ور نہیں تھا شعور تھا نکتہ داں نہیں تھا

حیات کو سوزِ عشق دے کر حیات کو جاوداں بنایا!
ترے شبابِ شباب پرور نے خود مجھے نوجواں بنایا

تجھے خبر ہے کہ میری شامیں سرشکِ خونیں سے تر بتر ہیں
تجھے خبر ہے کہ میری صُبحیں خموش و تاریک کس قدر ہیں
جو میرے حالات سے ہیں واقف وہ تیری غفلت سے باخبر ہیں
اِدھر بھی دیکھ اے شبابِ جلوہ کہ ہم بھی محتاجِ یک نظر ہیں

شعور افسردہ ہے جِلا دے۔ حیات خوابیدہ ہے جگا دے
مرے تصوّر کو روشنی دے مرے تخیّل کو جگمگا دے

مرے خیالوں میں بسنے والی! خدا رکھے بامُراد تجھ کو
رئیسِ حسرت نصیب دیکھے ہمیشہ دنیا میں شاد تجھ کو
مری محبّت پہ اے حسینہ! نہیں ہے کیا اعتماد تجھ کو
یہی حسیں نظم گنگنانا کبھی جو آؤں میں یاد تجھ کو
اگرچہ میں بھی یہ جانتا ہوں کہ بس سے باہر ہے بھول جانا
خیال میرا اگر ستائے تو مجھ کو بہتر ہے بھول جانا

غمِ حیات ہی ٹھہرے حیات کا حاصل
جو خواب ہے وہی تعبیرِ خواب ہو جائے

کوئی پکارتا ہے ہر اک حادثے کے ساتھ
تخلیقِ کائنات دگر کر رہے ہیں ہم

# عہدِ جوانی

اُف کتنا سیمیں اُف کتنا زرّیں اُف کتنا رنگیں عہد جوانی
دِن جلوہ پرور راتیں معطّر صُبحیں مُنوّر شامیں سہانی
وہ کیفِ ہستی وہ جوشِ مستی وہ خود پرستی وہ زندگانی
بارِ الم سے احساسِ غم سے خوابوں کی دیوی سپنوں کی رانی!

کیوں سرگراں ہے کیوں سرگراں ہے
میں بھی جواں ہوں تو بھی جواں ہے

یہ رقص و نغمہ فتنے پہ فتنہ یہ حُسن و جلوہ جادو پہ جادو
یہ زلفِ برہم یہ موئے پُرخم یہ نازِ پیہم یہ چشمِ آہو
یہ قدِّ بالا اے سروِ رعنا! یہ حُسن زیبا اے یارِ خوش خو
اے جانِ عالم سحرِ مجسّم ہمراز و ہمدم دلدار و دلجو

شرمِ تغافل کیوں درمیاں ہے
میں بھی جواں ہوں تو بھی جواں ہے

# خوبانِ خواب

عقل نے جب عشق کو بخشی کلیدِ قفلِ خواب
کُھل گئے میرے لیے شہرِ پری زاداں کے باب
دیکھتا کیا ہوں کہ اک دوشیزۂ نجم السحر
بے تکلّف بے تامّل بے تحیّر بے حجاب
وہ نشیلی انکھڑیوں پر میکدے چھائے ہوئے
مستِ مے، مستِ حیا، مستِ ادا، مستِ شباب
وہ لب و دنداں، وہ زلف و رخ، وہ حُسن و تازگی
سیب و سنبل، گوہر و یاقوت، سیماب و گلاب
وہ کبھی لطفِ تبسّم وہ کبھی چیں بر جبیں
وہ کبھی مہر و توجّہ وہ کبھی قہر و عتاب
نورِ دل، نورِ نظر، نورِ زمیں، نورِ جہاں
دخترِ حُسن و تجلّی، بنتِ ماہ و آفتاب

یہ سبک گامی پہ قرباں وہ لطافت پر نثار
موجِ مے، موجِ صبا، موجِ تجلّی، موجِ آب
سایۂ گیسو میں وہ انگڑائیاں لیتا ہوا
عہدِ گُل، عہدِ جوانی، عہدِ نو، عہدِ شباب
نازِ شوخی، نازِ جلوہ، نازِ مستی، نازِ حسن
کچھ تکلّم، کچھ ترنّم، کچھ تبسّم، کچھ حجاب
روئے تاباں کی ضیا زلفِ پریشاں کی فضا
صبحِ رنگینِ چمن شامِ جمیلِ ماہتاب
ناز سے رکھدے اگر روئے زمیں پر وہ قدم
آسماں بھی کہہ اُٹھے یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَاب
مجھ سے فرمایا کہ اے محوِ تماشا اے رئیس
اے ظہورِ بے تجلّی اے رسولِ بے کتاب
آ کہ تیری فکر کو دُوں تابشِ شمس و قمر
آ کہ تیرے شعر کو دُوں نکہتِ مشک و گلاب
آخر اب کس جلوۂ پنہاں کا تو ہے منتظر
تو کہ خود تیری تجلّی ہے حجاب اندر حجاب

تو کہ خود اپنے ہی بیچاک تخیّل کا اسیر
تیری قسمت میں تھا زلفِ خم بہ خم کا پیچ و تاب
تیرے کیا کیا ذکر ہیں نجم السحر کی بزم میں
والقمر تیرا لقب والشمس ہے تیرا خطاب
تو ذرا ، اپنی زباں سے کہہ تو دے تیری قسم
خود اُلٹ دیں گے وہ اپنے روئے زیبا سے نقاب
تیری دانائی سے برہم ہیں ترے اصنامِ دل
تیری بیداری سے مضطر ہیں ترے خوبانِ خواب

سُبک سرانِ مے و میکدہ سے کیا کہیے
یہی کہ گردشِ رطلِ گراں مبارک ہو
عطائے حضرتِ پیرِ مغاں نہ ہے قطرۂ مے
عطائے حضرتِ پیرِ مغاں مبارک ہو

# عرضِ غم

کبھی تو فرصت دے عرضِ غم کی مرے دلِ غم نواز مجھ کو
کبھی تو آزادِ سوز کردے جنونِ سُوز و گداز مجھ کو
یہ کس نے کافر کی نوعَروسی کا بھیجا پیغامِ راز مجھ کو
کہ چھیڑنا ہی پڑا بالآخر غمِ جدائی کا ساز مجھ کو
غلط کہ مجبُورِ دستِ گلچیں بہارِ سرو و سمن بنی ہے
نہیں نہیں کس نے کہہ دیا ہے کہ وہ حسینہ دلہن بنی ہے
یہ کیسے ممکن کہ نکہتِ گل کسی کی پابند ہو چمن میں؟
شگاف کیا نوکِ خار سے ہو عروسِ غنچہ کے پیرہن میں؟
بھلا کوئی بار یاب کیوں کر ہو اُس خود آرا کی انجمن میں
رسائی ذرّے کی سخت مشکل ہے ماہ و خورشید کے وطن میں
وہ شعلۂ تند و شمعِ سرکش! کوئی اٹھائے نقاب اُس کا؟
ہوس کی پھُونکوں سے کیا بجھے گا چراغِ حسن و شباب اُس کا؟

وہ حسن و دوشیزگی کا پیکر مجالِ عرضِ ہوس کہاں ہے
نظر کی جنبش بھی بارِ خاطر حجابِ عصمت جو درمیاں ہے
شباب ہر چند خود نما ہے بہار ہر چند نوجواں ہے
مگر غرورِ شباب و جلوہ قدم قدم پر نگاہ باں ہے
جہاں وہ خلوت فروز ہوگی وہاں ہوس کا گزر نہ ہوگا
زباں کو تابِ سخن نہ ہوگی نظر کو ذوقِ نظر نہ ہوگا
اگرچہ کافر کی نوعروسی کا مجھ کو اب تک یقیں نہیں ہے
میں جانتا ہوں کہ اُس کا محرم مرے علاوہ کہیں نہیں ہے
مگر زمانے کی گردشوں سے وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
اگر یہ سچ ہے کہ اُس کے دل میں وہ جذبۂ اوّلیں نہیں ہے
تو یا الٰہی! شکستِ عہدِ وفا کی کافر کو یہ سزا دے
کہ اُس کو محرومِ سوز کردے گداز ناآشنا بنادے

وہ لاکھ چاہے مگر نہ دل میں کبھی محبّت کی روشنی ہو
نہ اشک سے آنکھ میں نمی ہو نہ آہ سے درد میں کمی ہو
لطیف جذبوں سے اُس کا دامن خدا کرے اِس طرح تہی ہو
کہ جیسے مرمر کی مورتی میں نہ تازگی ہو نہ زندگی ہو
کوئی بھی گائے نہ گیت اُس کا کوئی بھی چھیڑے نہ راگ اُس کا
عذاب بن جائے یا الٰہی! خود اُس کے حق میں سہاگ اُس کا

ہم جو روتے ہیں شبِ غم تو ہمیں رونے دو
انجمِ چرخِ ہدایت ہیں ہمارے آنسو!
کون یہ مانعِ فریاد و بکا ہوتا ہے؟
ایک بے باک صداقت ہیں ہمارے آنسو

اے رئیسؔ امروہوی کی جان اے جانِ رئیس
کوچ ہے در پیش گوچہ گرد یاروں کو سلام
ہر قدم پر جن کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہوں میں
جانِ من ! اُن رہروؤں اُن رہ گزاروں کو سلام
اجنبی لوگوں میں مجھ کو بے سہارا دیکھ کر
جو سہارے تو نے بخشے اُن سہاروں کو سلام
جو ترے عارض میں مہکے ان شگوفوں کو نوید
جو تری پلکوں پہ چمکے اُن ستاروں کو سلام
تیری گہری خوبصورت شوخ آنکھوں کو دعا
شوخ آنکھوں کے حیا پرور اشاروں کو سلام
تیری باہوں کی کھنکتی چوڑیوں کو الوداع
تیرے کانوں کے دمکتے گوشواروں کو سلام
تیرے رخسارِ شگفتہ کے گلابوں پر درود!
تیرے لب ہائے حسیں کے غنچہ زاروں کو سلام
تیرے دروازے کے شیشم کو پیامِ بندگی !
تیرے آنگن کی چنبیلی کی بہاروں کو سلام
بن کھلی کلیوں کے فرحت بخش گلدستوں کو پیار
نو شگفتہ نوجواں پھولوں کے ہاروں کو سلام

# مجھے کیا

درمانِ غمِ ہجر اگر ہو تو مجھے کیا
ظالم ! تجھے اب میری خبر ہو تو مجھے کیا
گُل چینیٔ جلوہ مری قسمت میں نہیں ہے
تم صحن چمن میں گُلِ تر ہو تو مجھے کیا
جب خاک بھی باقی نہ رہی قلب وجگر کی
تم میرے لیے خاک بسر ہو تو مجھے کیا
اب اپنی دعاؤں پہ ہنسی آتی ہے مجھ کو
اب میری دعاؤں میں اثر ہو تو مجھے کیا
میرے دلِ ویراں میں اُجالا نہیں ہوتا
تم غیرتِ خورشید و قمر ہو تو مجھے کیا
اچھا ہے کہ بِن میرے گزر جائے کسی کی
اور یوں بھی کسی کی نہ گزر ہو تو مجھے کیا

اس ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو نہ چھیڑو
ہرگز غمِ ایام کے ماروں کو نہ چھیڑو

دنیا سے نرالا ہے مرا رنگِ طبیعت
تم میری طبیعت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں
جس جذبۂ وحشت نے مجھے تم سے چھڑایا
اُس جذبۂ وحشت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں
جب تک کہ محبّت کی حقیقت کو نہ سمجھو!
شاعر کی محبّت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں
جب تک چمنِ زیست کے کانٹوں سے نہ اُلجھو
پھولوں کی لطافت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں
ہاں ہاں! مرا دعویٰ ہے کہ با ایں ہمہ دانش
تم عشق کی فطرت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں
میں لاکھ کروں تم سے تغافل کی شکایت
تم میری شکایت کو سمجھ ہی نہیں سکتیں
کیوں عشق ہے بیگانگیٔ شوق کی حد تک
اِس راز کو سمجھا ہے نہ سمجھو گی ابد تک

بے شک تم ابھی تک مری نظروں میں بسی ہو
لیکن وہ نظر اَور تھی ظالم ! یہ نظر اور
اب تم ہو کسی اور ہی خلوت کی تجلّی
اب میرے بجائے ہے کوئی مدِ نظر اور
چاہوں بھی تو اب تم سے رفاقت نہیں ممکن
تم غیر کے ہمراہ مری راہ گذر اور
تم تک تو بہرحال رسائی نہیں دشوار
حائل ہے مرے سامنے اِک شخص مگر اور
اللہ رے آئینِ محبت کی دو رنگی
آئینے کی مانند اِدھر اور اُدھر اور
میں بھی ہدفِ شوق کوئی ڈھونڈ ہی لوں گا
مل جائے گا تم کو بھی نشانے یہ جگر اور
یوں میری بغاوت کی سزا دو مجھے آخر
میں بھول گیا تم بھی بھلا دو مجھے آخر

# میرے لیے ہے

نزہت کدۂ کون و مکاں میرے لیے ہے
آفاق کراں تابہ کراں میرے لیے ہے
تزئینِ مہ و کاہ کشاں میرے لیے ہے
محبوبۂ تخلیق جواں میرے لیے ہے
آرائشِ بزمِ دوجہاں میرے لیے ہے

دَرّانہ گزر جاتا ہوں ہر قیدِ مکاں سے
میری سی روش نکہتِ گل لائے کہاں سے
مرغانِ چمن دنگ مرے طرزِ فغاں سے
کیا گل کو تعلق ہے بہار اور خزاں سے
گلشن میں بہار اور خزاں میرے لیے ہے

کیا حُسنِ دل افروز ؟ نہیں ہے مری خاطر
ہاں ہاں وہ محبّت کا امیں ہے مری خاطر
رعنائیِ رُخسار و جبیں ہے مری خاطر
کافر! یہ ترا نازِ حسیں ہے مری خاطر
ظالم ! یہ ترا حُسنِ جواں میرے لیے ہے
میں بے خود و سرشار و جواں تیرے لیے ہوں
اے جانِ وفا! زمزمہ خواں تیرے لیے ہوں
آوارۂ بازارِ جہاں تیرے لیے ہوں
میں تیری قسم شعلہ بجاں تیرے لیے ہوں
تو میری قسم شعلہ بجاں میرے لیے ہے

# بندۂ بے دام

کوششِ نامہ و پیغام بجا ہے لیکن
فرصتِ نامہ و پیغام کہاں سے لاؤں
خوابِ سرمست کی راتیں تپشِ شوق کے دن
اے مرے شوخِ دل آرام کہاں سے لاؤں؟
مقتلِ مہر و وفا ہیں یہ شب و روزِ حیات
زلف و رُخ کے سحر و شام کہاں سے لاؤں
جس طرف دیکھیے ویرانی ہی ویرانی ہے
شوقِ تزئینِ در و بام کہاں سے لاؤں
زہرِ خونابۂ ہستی ہے مرے ساغر میں
مے و مستی کا کوئی جام کہاں سے لاؤں؟
ساری دنیا مجھے بے تاب نظر آتی ہے
بس ترے واسطے آرام کہاں سے لاؤں

تو ہی کہہ دے کہ تری نذرِ عقیدت کے لیے
عاشقی کی ہوسِ خام کہاں سے لاؤں
تو ہی بتلا کہ ترے عارضِ رنگیں کے لیے
شکنِ زلفِ سیہ فام کہاں سے لاؤں
مجھ کو ملتی نہیں ڈھونڈے سے کہیں جنسِ بہار
اے مرے شوخ گُل اندام کہاں سے لاؤں؟
جنگ و تخریب سے کُچلی ہوئی اس دنیا میں
امن و تعمیر کے پیغام کہاں سے لاؤں
میرے افکار کی پستی پہ بگڑنے والی!
مستیِ حافظ و خیّام کہاں سے لاؤں؟
عصرِ حاضر کے حوادث کا ابھی ہے آغاز
خبرِ عہدِ خوش انجام کہاں سے لاؤں
تو مرے ساتھ نہ چل اے مری ہمراہِ سفر!
منزلِ تازہ بہر گام کہاں سے لاؤں؟
لاکھ ہوں بندۂ بیدام پہ انصاف ہے شرط
دل لگانے کے لیے دام کہاں سے لاؤں

# نگاہِ شوق

اے نگاہِ شوق ! سوزِ دل کا آئینہ ہے تو
اور کچھ خُوں گشتہ ارمانوں کا گنجینہ ہے تو
اِس دلِ مشتاق کی غم خوارِ دیرینہ ہے تو
ترجمانِ دل .. نقیبِ سوزشِ سینہ ہے تو
تیرا احساں ہے ہراک لب تشنۂ گفتار پر
بھیجتی ہے دل کی خبریں آنسوؤں کے تار پر
حُسن کے معصُوم دل میں گھر بناتی ہے کبھی
اضطرابِ شوق کا قصّہ سناتی ہے کبھی
بے وفاؤں کو وفا کیشی سکھاتی ہے کبھی
جلوۂ جاناں کو آئینہ دِکھاتی ہے کبھی
وہ رسائی تجھ کو دی ہے عشق کے پیغام نے
کچھ نہیں ہے پردۂ محمل بھی تیرے سامنے

حُسنِ فطرت کی ہے اک تو ہی حقیقی ترجماں
دیکھتی ہے سینۂ گل میں جمالِ باغباں
اے نگاہِ شوق! تو ہے آپ اپنی ترجماں
بے دلی کی داستاں ہے، بے زبانوں کی زباں

جستجو حُسنِ اَزل کی کیوں نہ ہو آساں تجھے
پتّہ پتّہ ہے چمن کا دفترِ عرفاں تجھے

آسماں کی مملکت میں بھی سفر کرتی ہے تو
گردشِ افلاک کو زیر و زبر کرتی ہے تو
آں سوئے بزمِ فلک جس دم گزر کرتی ہے تو
قدسیوں کو سُوزِ دل سے باخبر کرتی ہے تو

شوقِ نظّارہ کی خاطر کُو بکُو آوارہ ہے
اے نگاہِ شوق! تو سودائیِ نظارہ ہے

# پھول

سیرِ گُل کو کون آیا منتظر تھے کس کے پھول
دیکھ کر کس کو شگفتہ ہو گئے نرگس کے پھول
کتنی کلیاں کھِل گئیں، بندھ کر کسی کے ہار میں
کس قدر مہکے ہیں اُن کی سیج پر پس پس کے پھول
کھُل رہے ہیں کس لیے سیپارۂ دل جا بجا
آج ہیں گُلشن میں اے ذوقِ شہادت کس کے پھول[1]
لُوٹ لے ہر تختۂ گلشن کو اے گلچینِ وقت!
کیا خبر کس کس کے ہاتھوں میں پڑیں کس کس کے پھول
قدرِ افکارِ حسین کیا ہو کہ افکارِ حسین
تہ نشیں سیپی کے موتی، دامنِ مفلس کے پھول
اللہ اللہ کس قدر دیدہ وری کا قحط ہے
عہدِ گُل میں بھی نظر آتے نہیں نرگس کے پھول

---

[1] میت کے سوئم میں قبر پر پھول چڑھانے کی رسم تھی اور قرآن خوانی!

بادۂ گل گوں پہ ساقی کو گماں ہے پھول کا
میں سمجھتا ہوں "گلابی" بن گئے رِس رِس کے پھول
میں نے زخموں سے سجایا ہے اُطاقِ روح کو
اے زرِ گُل ! تیری قسمت میں طلا کے مِس کے پھول
بوئے گُل سے دردِ سر عارض نہ ہو جائے کہیں
اے عروسِ ناز! ماتھے پر لگا گِھس گِھس کے پھول
لالۂ کہسار ! گُل چینی کی دعوت تا کجا؟
میرے دامن میں جگہ پاتے نہیں بے جِس کے پھول
کاروانِ رنگ و بو گزرا کچھ اس رفتار سے
سعیِ پابوسی میں سُرمہ بن گئے پِس پِس کے پھول
خار و خس کی مثل پھولوں کو بھی لازم ہے ثبات
یہ تماشا کیا کہ در آئی خزاں اور کھسکے پھول
شوق کو ہے اُس چمن بندِ حقیقی کی تلاش
دو جہاں کو آج تک مہکا رہے ہیں جس کے پھول
اللہ اللہ شاخسارِ فکر کی گُل کاریاں
نوبہارِ سُنبلستانِ سخن ہیں اِس کے پھول

# ناچ

اے شمیمِ گل! نہ فرشِ سبزۂ رعنا پہ ناچ
خار و خس پر رقص فرما، سینۂ صحرا پہ ناچ
رُخ نہ کر ساحل کا اے موجِ بلا انگیزِ عشق!
سطحِ طوفاں پر مچل پہنائیِ دریا پہ ناچ
پاسِ آدابِ محبّت تا کجا اے قیسِ عصر!
بے تکلف رہ گذارِ ناقۂ لیلیٰ پہ ناچ
آج اے مطرب! خود اپنے نغمۂ مستی پہ جھوم
آج اے ساقی! سرودِ قلقلِ مینا پہ ناچ
پائے خوں آلود سے نوکِ سناں پر رقص کر
کون کہتا ہے کہ فرشِ مخمل و دیبا پہ ناچ
ذرّہ ہائے خاک پر رقصِ غلامی تا کجا!
بامِ ماہ و سقفِ عشرت خانۂ زہرہ پہ ناچ

# آشفتہ نوائی

میری آشفتہ نوائی سے نہ بیزار ہو تو
یہی ٹھٹھرے ہوئے نغمے یہی سہمے ہوئے راگ
آگ بن جائیں گے اِک روز بھڑکتی ہوئی آگ
اِنھی آشفتہ نواؤں سے فضا گونجے گی !
بزمِ افسردۂ اربابِ وفا گونجے گی
اِسی آہنگ میں زحمت کشِ گفتار ہو تو !
میری آشفتہ نوائی سے نہ بیزار ہو تو
مُطربِ وقت مشیّت کا مغنّی میں ہوں
لاکھ الہام مرے شیوۂ گفتار میں ہیں
لاکھ اعجاز مرے نُطقِ فسوں کار میں ہیں
چاک میرے نفسِ تُند سے دامانِ سکوت
میری فریاد ہے ہنگامۂ ہستی کا ثبوت

میری فریاد کا مقصد ہے کہ بیدار ہو تو
میری آشفتہ نوائی سے نہ بیزار ہو تو
سینۂ عصر مری شعلہ نوائی سے ہے گرم
نفسِ سوختۂ مطربِ تقدیر ہوں میں
اپنی فریاد جگر سوز کی تاثیر ہوں میں
میرے نغموں کا ابھی کوئی طلب گار نہیں
کوئی اِس جنس گرامی کا خریدار نہیں
صاحبِ ذوق اگر ہے تو خریدار ہو تو
میری آشفتہ نوائی سے نہ بیزار ہو تو
مطربِ وقت ! مرے نغمۂ خاموش کو سُن
سُن کہ یہ بربطِ بے صوت ہے مضرابِ حیات
اِس کے ہر تار میں ہے نغمۂ بیتابِ حیات
طبعِ حسّاس کو ناساز نہ کر ساز ملا
تو بھی مطرب مری آواز سے آواز ملا
اور اِس نغمۂ سرمست سے سرشار ہو تو
میری آشفتہ نوائی سے نہ بیزار ہو تو

# اے مری تسکینِ حیات

تو مرے ساتھ نہ رُو اے مری تسکینِ حیات
میں جو رُوتا ہوں تو رُونا ہے مقدّر میرا
یہی سرمایۂ تسکیں یہی جوہر میرا
میرے آنسو مری قیمت کو بڑھا دیتے ہیں
میرے شعروں میں نیا حُسن جگا دیتے ہیں
تیرے اشکوں میں نہ وہ حُسن نہ تاثیر نہ بات
تو مرے ساتھ نہ رُو اے مری تسکینِ حیات
تو ہے اک غنچۂ نوخیزِ چمن زارِ شباب
تو مری شبنمِ گریہ سے سنور جائے گی
ہر ادا اور نِکھر اور نِکھر جائے گی
میرے اشکوں سے ہے دامن ادب و شعر کا تر
تیرے اشکوں کی نہیں قدر زمانے میں مگر

قیدِ ہستی میں ہے مشکل غمِ ہستی سے نجات
تو مرے ساتھ نہ رُو اے مری تسکینِ حیات

اشک اک شاعرِ حسّاس کا سرمایہ ہیں
دولتِ اشک نہیں سارے زمانے کے لیے
غم کے موتی ہیں فقط میرے خزانے کے لیے
تو "خدا تیرے تبسّم کو سلامت رکھے"
دُرِّ شہوار لٹانے کا سبق لے مجھ سے
پھر نہ آئے گی یہ کھوئی ہوئی دولت ترے ہات
تو مرے ساتھ نہ رو اے مری تسکینِ حیات

میرے آنسو بخدا معجزۂ فطرت ہیں!
اِن میں اشکوں کی حرارت ہے تو شبنم کا مزاج
یہ مری رُوح کی خدمت میں ہے فطرت کا خراج
کبھی اشعار کے سانچے میں جو ڈھل جاتے ہیں
اور تابندہ و شاداب نظر آتے ہیں
تیرے اشکوں میں مری جان! یہ جوہر نہ صفات
تو مرے ساتھ نہ رُو اے مری تسکین حیات

تسلیم عرضِ جلوہ گرانِ دیارِ ناز!
اے آہوانِ وادیٔ گل بار اَلسّلام

اب تم سے اپنا ربط ہوا ہے براہِ راست
اے کج روانِ سادہ و پرکار اَلسّلام

اب تم سے اپنا کام پڑا ہے بطرزِ خاص
اے خاصگانِ خلوتِ اسرار السّلام

ہم آ گئے حدودِ در و بام پھاند کر
اے شاہدانِ روزنِ دیوار السّلام

ہم آ گئے قیودِ در و بام توڑ کر
زندانیانِ گیسوئے خمدار السّلام

ہم ہیں گروہِ شوق و تمنّا کے سربراہ
ہاں اے قبیلۂ لب و رخسار السّلام

ہم ہیں دیارِ مے کے پرانے سیاہ مست
نو واردانِ خانۂ خمّار السّلام

ہم ہیں سپاہِ عہدِ بہاراں کے پیش رَو
ہاں اے حدیقۂ گل و گلزار السّلام

اے زندگی کی موج گرانبار الوداع
اے عاشقی کے سیلِ سُبک سار السّلام

# ۶

پھر کسی غم میں گرفتار نظر آتی ہو
کیوں کئی روز سے بیزار نظر آتی ہو
کیا کسی شوخ سہیلی نے تمہیں ٹوک دیا
یوں جو محجوب و دِل افگار نظر آتی ہو
کس کی فرقت میں پریشاں ہیں تمہارے گیسو
ہجر میں کس کے عزادار نظر آتی ہو
کس نے تجدیدِ محبّت کی جسارت کی تھی
میں نہیں، تم بھی خطاوار نظر آتی ہو
تم نے اظہارِ محبّت کا اثر دیکھ لیا
تم بھی آمادۂ اظہار نظر آتی ہو
میں تمہاری روشِ لطف وستم دیکھ چکا
تم ہر اک رنگ میں دلدار نظر آتی ہو

میں تمہارا اثرِ قہر و کرم جانچ چکا
تم بہرحال فسوں کار نظر آتی ہو
تم سمجھتی ہو کہ ہر قید سے آزاد ہوں میں
مجھ سے پوچھو تو گرفتار نظر آتی ہو
زندگی خونِ تمنّا ہے مگر تم مجھ کو
محوِ رنگینیِ افکار نظر آتی ہو
دیو زادوں کی یہ دنیا ہے اور اِس دنیا میں
تم بہت نازک و خود دار نظر آتی ہو
صرف ماحول ہی کیا؟ صرف روایات ہی کیا؟
خود سے بھی برسرِ پیکار نظر آتی ہو
برہمی کا نہ کرو عذر کہ اِس عالم میں
اور بھی مجھ کو طرحدار نظر آتی ہو!
ہاں تو اِس بات کا' اب تک نہ ملا مجھکو جواب
کیوں کئی روز سے بیزار نظر آتی ہو

# جانِ من!

جانِ من! مجھ سے بجا ہے یہ شکایت تیری
کہ مرے شعر میں ماضی کا وہ انداز نہیں
اے مجھے حافظ و خیّام بنانے والی!
اب مری فکر میں سرمستیِ شیراز نہیں
جو تری رُوح کے نغموں کو جگا دیتی تھی
اب مِرے پاس وہ رعنائیِ آواز نہیں
کاش تو میری خموشی کی صدا سُن سکتی
نغمۂ غم کے لیے حاجتِ آواز نہیں
آج دنیا کو ضرورت ہی نہیں خوابوں کی
آج دنیا میں کہیں خواب گہِ ناز نہیں
ہے کوئی اور ہی قوّت جو بدلتی ہے ہمیں
وقت اور یہ فلکِ شعبدہ پرداز نہیں

# اے وا دلِ من

جشنِ بہاراں گلشن بہ گلشن
پھولوں کی ضو سے ہر شاخ روشن
شبنم کے موتی کلیوں کے دامن
شاموں کا جادو، صُبحوں کا جوبن
گیتوں کی برکھا نغموں کا ساون
کیا شعبدہ گر کیا سحر افگن
شاداب و شاداں کیا باغ کیا بن
اِس گُل کدے ہیں اے یارِ پُر فن
خود میرا دل ہے خود میرا دشمن
اے وا دلِ من صد وا دلِ من
شہروں کی رونق اللہ اکبر
ہنگامہ آرا ہنگامہ پرور
گلیاں مصفا کوچے معطّر
وہ قصر و ایواں بہتر سے بہتر

یاروں کے جمگھٹ رندوں کے لشکر
تازہ تماشا ہر رہِ گذر پر
تصویرِ ہستی کتنی منوّر؟
میرا مرقّع بے رنگ و روغن
اُف کیسی وحشت اُف کتنی الجھن
اے وا دلِ من! صدوا دلِ من

آراستہ ہے بزمِ عزیزاں
کیا کیا ہنرور! کیا کیا سخنداں!
شعروں کی محفل فن کا دبستاں
یارانِ محفل مست و غزل خواں
جذبے پُر آتش سینے پُر ارماں
خود بین و خرم خوش باش و خنداں
سرشار و بے خود رنگیں و رقصاں
میں اشک و خوں سے آلودہ دامن
رہبر خود اپنی منزل کا رہزن
اے وا دلِ من صدوا دلِ من!

قبل از سحر کے دلکش نظارے
بامِ فلک پر وہ چاند تارے
بُجھتے ہوئے سے نُوری شرارے
وہ صُبحِ نو کے دھندلے اشارے
بادِ سحر نے بھر کے طرارے
دشت و دمن کے گیسو سنوارے
لوگ جاگ اُٹھے غفلت کے مارے
محوِ عبادت شیخ و برہمن!
شعلہ بجاں ہوں میں سوختہ تن
اے وا دلِ من صدوا دلِ من

یہ شام جیسے صبحِ جوانی
کتنی سجیلی کتنی سُہانی
مغرب کہ مشرق سب ارغوانی
اُس پر شفق کی جلوہ فشانی
رنگیں دھندلکے شب کی نشانی
وہ دل فریبی وہ دل ستانی

یہ شام اور میں اے یارِ جانی
محدودِ خانہ، محبوسِ مسکن!
افسوس و شکوہ، فریاد و شیون
اے وا دلِ من! صد وا دلِ من!
کم بخت دل ہے درماں گزیدہ
غنچہ ہے بے شک پر نا دمیدہ
حرماں کا چشمہ حسرت چشیدہ
آفت کا پتلا آفت رسیدہ
نا آزمودہ نا آرمیدہ!
بیتاب جاں ہے بے خواب دیدہ
کرب نہاں سے کیا کیا کبیدہ
ہاتھوں میں جیسے پتھر کے کنگن
پاؤں میں جیسے زنجیرِ آہن
اے وا دلِ من صد وا دلِ من

# .....کا خط

خدا کرے کہ مری عرض ناگوار نہ ہو
اِسے نہ زینتِ لفظ و بیاں کہے کوئی
مرا کلام ہے خود شکوہ سنجِ ناکامی
مجھے نہ شاعرۂ نوجواں کہے کوئی
میں اپنے سازِ شکستہ کی ہوں صدائے خموش
مجھے نہ مطربۂ خوش بیاں کہے کوئی
یہ کیا ضرور کہ اک غنچۂ فسردہ کو
بہارِ ناز و گلِ گلستاں کہے کوئی
مجھے سماج نے رکھا نہیں کسی قابل
مجھے نہ ملکۂ نورِ جہاں کہے کوئی
یہاں کسی کی کہانی کوئی نہیں سنتا
عبث فسانۂ سوزِ نہاں کہے کوئی
نہیں اجازتِ شکوہ، شکستہ حالوں کو
خدا کے واسطے چھیڑو نہ سننے والوں کو

# ....کو جواب

نہیں نہیں تجھے عظمت نشاں بناؤں گا
فروغِ گُل کدۂ جاوداں بناؤں گا
جسے بہار نے اپنے لہو سے سینچا ہے
میں اُس چمن میں تجھے حکمراں بناؤں گا
جہانِ جاں ہے ترا التفات جانِ رئیس
اِس التفات کو جانِ جہاں بناؤں گا
اگر یہی ہے محبّت کی سحر تاثیری
میں تجھ کو ساحرۂ نوجواں بناؤں گا
اگر یہی ہے مری نظم کی جہاں گیری
میں تجھ کو ملکۂ نورجہاں بناؤں گا
وہ ابتدائے محبّت کا عہد یاد تو کر
خدا کے واسطے تو مجھ پہ اعتماد تو کر

# دلِ مشتاق و حزیں

یہ شبِ یاس و تمنّا یہ سکوتِ غم گیں
دل میں مبہم سی خلش وہم میں ہلکا سا یقیں
نگہِ شوق میں رقصاں کوئی تصویرِ حسیں
لالہ رُخ غُنچہ دہن عربدہ جو زہرہ جبیں
پھر مگر کچھ بھی نہیں
دلِ مشتاق و حزیں اے دلِ مشتاق و حزیں

ذہنِ تاریک، یہ صدیوں کی روایات کا بار
اُفقِ فکر پہ بکھرا ہوا ماضی کا غبار
وہ شبِ تار کے پُر ہول رُموز و اسرار
وہ گراں بارِ تخیّل، وہ ہجومِ افکار
غمِ دُنیا غمِ دیں
دلِ مشتاق و حزیں اے دلِ مشتاق و حزیں

ہاں وہ ویرانۂ بے نور وہ آفات کی رات
رات اور منتشر افکار و خیالات کی رات
اُف وہ ارواح کی جنّات کی ظلمات کی رات
جیسے یہ عالمِ امکاں ہے فقط رات کی رات
صُبح دم کچھ بھی نہیں
دلِ مشتاق و حزیں اے دلِ مشتاق و حزیں
اُفقِ تیرہ پہ ظلمت کی تہوں کا اک جال!
جس طرح قطبِ شمالی کی شبِ نیمۂ سال
غم زدہ سوختہ جاں مضطرو تنہا بے حال
بسترِ غم پہ تڑپتے ہُوئے ہر دم یہ خیال
وہ نہ آجائے کہیں!
دلِ مشتاق و حزیں اے دلِ مشتاق و حزیں

# اے انجمن آرا

برقع تو اُلٹ دو رُخِ روشن سے خدارا، اے انجمن آرا
بدلی میں کہاں تک مری قسمت کا ستارا، اے انجمن آرا
کیا مجھ سے مناسب ہے یہ دزدیدہ نگاہی، یہ شرمِ الٰہی
دزدیدہ نگاہوں سے محبّت کا اشارا، اے انجمن آرا
یا وہ نگہِ لطف کہ ہنگامِ نوازش، سرمایۂ نازش
یا یہ ستمِ ناز کہ دانستہ کنارا، اے انجمن آرا
آغاز وہ آغاز کہ الطافِ مجسّم، وہ پیار کا عالم
انجام یہ انجام کہ ہر ظلم گوارا، اے انجمن آرا
میں ہوں وہی اب تک مرے اخلاص میں شک کیوں؟ آخر یہ جھجک کیوں؟
کیا جانچ ہے منظور محبّت کی دوبارا، اے انجمن آرا
وہ شوخیِ گفتار نہ وہ حُسنِ تکلّم، غمزہ نہ تبسّم
وہ اُوٹ سے پردے کی نوازش نہ اشارا اے انجمن آرا

کیوں آج نظر آتے ہیں بدلے ہوئے تیور، غصّے میں سراسر
میری کوئی تقصیر تو ثابت ہو خدارا، اے انجمن آرا
ہر دم یہی آشفتہ مزاجی ہے تو بہتر، ہم تم سے بچھڑ کر
ڈھونڈیں گے کوئی اور محبّت کا سہارا، اے انجمن آرا
تم ہی کوئی دُنیا سے نرالی تو نہیں ہو، مانا کہ حسیں ہو
ہر گام یہ نظروں کو میسّر ہے نظارا، اے انجمن آرا
دنیا میں حسینوں کی کمی تھی نہ کمی ہے، دل میں یہ جمی ہے
پیمانِ وفا تم سے کریں گے نہ دوبارا، اے انجمن آرا
دنیا جسے کہتے ہیں وہ بازار ہے بازار، ہر جنس ہے تیار
ہر جنس پہ ہے اہلِ تجارت کا اِجارا، اے انجمن آرا
بِکتا ہے یہاں حُسن بھی جلوے بھی نظر بھی، عزّت بھی ہنر بھی
ہر شخص کا ہے بَردہ فروشی پہ گزارا، اے انجمن آرا
بازارِ جہاں میں ہے ہر اک جنس کی قیمت، ہو مرد کہ عورت
جو نرخ تمہارا ہے وہی نرخ ہمارا، اے انجمن آرا

شاعر ہو کہ فن کار مصوّر ہو کہ نقّاش ہر فرد ہے اک لاش
لاشوں کی تجارت میں ضرر ہے نہ خسارا، اے انجمن آرا
تم بھی ہو اسی طرح سے اک مالِ تجارت، میری بھی ہے قیمت
اِس ظلم پہ قابو نہ ہمارا نہ تمہارا، اے انجمن آرا

یہ حادثاتِ شب و روز بے سبب تو نہیں
بدل رہا ہے کوئی خواب ناز میں پہلو

# زخمِ کاری

بھول سکتا ہے کوئی یہ زخمِ کاری ہائے ہائے
وہ بچھڑتے وقت تیری بے قراری ہائے ہائے
وہ تری پلکوں پہ اشکوں کے ستاروں کا طلوع
بے خودی میں وہ مری اختر شماری ہائے ہائے
وہ ترے شاداب رخساروں پہ زردی کی جھلک
وہ مرے زخمِ جگر کی لالہ کاری ہائے ہائے
وہ ڈھلک جانا ترے سر سے دوپٹہ بار بار
باوجودِ اہتمامِ پردہ داری ہائے ہائے
دل میں دھڑکن نبض میں سستی رگوں میں سنسنی
وہ مزاجِ ناز کی ناسازگاری ہائے ہائے
خود الجھنا خود مچلنا خود تڑپ جانا ترا
بے بسی، ناطاقتی، بے اختیاری ہائے ہائے

جان سے بیزار جی سے تنگ جینے سے خفا
نا امیدی اور نا اُمّیدواری ہائے ہائے

سر جُھکا کر دیر تک وہ دم بخود رہنا ترا
سر اُٹھا کر پھر وہی فریاد و زاری ہائے ہائے

خودکشی کا ذکر مرگِ ناگہاں کا تذکرہ
دونوں جانب آرزوئے جانسپاری ہائے ہائے

وہ ترا کہنا کہ کیا میرے چلے جانے کے بعد
ختم ہوجائے گی رسمِ دوستداری ہائے ہائے

میری خاموشی پہ وہ اصرار سے کہنا ترا
ہیں تمہاری ہوں تمہاری ہوں تمہاری ہائے ہائے

ہائے یہ وعدہ کہ میں پھر لوٹ کر آجاؤں گی
اور اِس وعدے پہ تیری اشکباری ہائے ہائے

وہ عزیزوں کی شکایت وہ زمانے کا گِلہ
پھر وہ پیمانِ وفا کی استواری ہائے ہائے

وہ کبھی رُونا کبھی خاموش ہوجانا ترا
شوقِ وصل و بیمِ ہجراں باری باری ہائے ہائے

وہ مرا کہنا کہ دل کچھ مضطرب ہے آہ آہ
وہ ترا کہنا کہ جی ہے بھاری بھاری، ہائے ہائے
وہ مرا کہنا کہ ضبطِ غم ہے مشکل کیا کروں
وہ ترا کہنا کہ قسمت ہے ہماری، ہائے ہائے
وہ تری رخصت کا دن وہ شام کی بوجھل فضا
وہ درو دیوار پر اک ہول طاری، ہائے ہائے
اُف وہ سناٹا کہ جیسے شہر خاموشاں کی رات
اور اک مدھم سا شورِ آہ و زاری، ہائے ہائے
مجھ سے رو رو کر وہ تیرا پوچھنا کیا وقت ہے؟
وقت کا وہ شکوۂ ناسازگاری، ہائے ہائے
دوپہر ڈھلتے ہی چہرہ زرد پڑ جانا ترا
پھر نئے سر سے نئی اک بیقراری، ہائے ہائے
لے کر اپنے سرد تر ہاتھوں میں میرا دستِ سرد
گرم جوشی کی اداتے اضطراری، ہائے ہائے
سُرخ سرخ آنکھوں سے ننھے ننھے آنسو پونچھ کر
پھر مجھے تاکیدِ ضبطِ اشکباری، ہائے ہائے

جاتے جاتے بھی وہ باتیں آہ وہ باتیں تری
ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی پیاری پیاری، ہائے ہائے
وہ مری آنکھوں میں عکسِ نیم جانی الاماں
وہ ترے چہرے پہ رنگِ سوگواری، ہائے ہائے
وہ مرے ہونٹوں پہ کچھ بے ربط جملے الغیاث
اے سکونِ دل ! وہ تیری غم گساری ہائے ہائے
ہاں وہ تیرا وعدۂ محکم وہ میرا عہدِ شوق
پھر وہ تیرا شکوۂ بے اعتباری، ہائے ہائے
وہ گلے مل کر ترا جانا بہ تعجیل، تمام
یہ صدا سن کر کہ حاضر ہے سواری ہائے ہائے

# گم شدہ قبیلے

یا رب کہاں گئے وہ
دس گم شدہ قبیلے
مرد اُن کے شیر افگن
وہ سیم اور آہن
تیغ آزما تبر زن
مضبوط اور سجیلے
دس گم شدہ قبیلے
یا رب کہاں گئے وہ
دس گم شدہ قبیلے
وہ مرد جن کے بازو
خونریز، معرکہ جُو!
وہ عورتیں کہ منظر
جن کا سرور آور

پرُ آرزو پرُ ارماں
سچّے جری ہٹیلے
دس گم شدہ قبیلے
یا رب کہاں گئے وہ
دس گم شدہ قبیلے
دس گم شدہ قبیلے
آخر کہاں ہیں یارب
وہ گم شدہ قبیلے
سرمایۂ جہاں تھے
فطرت کے رازداں تھے
وہ گم شدہ قبیلے
پیکر نہیں تھے جاں تھے
اسرارِ لامکاں تھے
انوارِ لازماں تھے
بے شک مگر کہاں تھے

وہ گم شدہ قبیلے
وہ گم شدہ قبیلے
ہاں کس قدر بہادر
ہاں کس قدر سجیلے
ہم اُن کے جانشیں ہیں
لیکن وہ خود نہیں ہیں
وہ خواجۂ زماں تھے
ہم بندۂ زمیں ہیں
آخر وہ اب کہاں ہیں
آخر وہ اب کہیں ہیں؟

غرورِ فرقۂ زہّاد ہے بجا لیکن
کوئی حریفِ حریفانِ جام ہو تو سہی

# منظومات

# فلسفیانہ
# سیاسی
# متفرق

# فکر و نظر

مرے شعور کا عرفاں کسے نصیب کہ میں
سروشِ روحِ ازل ہوں سما سے آیا ہوں

بے قید تفکّر و تامّل
اللہ رہے وہ حقیقتِ کُل
توحید کے مرتبے میں جس کا
اللہ ہے درجۂ تنزّل

# عالمِ لا

سنیے کہ لوحِ وقت پہ کیا لکھ دیا گیا
حالِ بشر بہ فضلِ خدا لکھ دیا گیا؟
اعمال نامۂ حمقاء لکھ دیا گیا؟
میں نے کہا لکھا؟ تو کہا لکھ دیا گیا

سب کچھ بہ ذیلِ لُطف و عطا لکھ دیا گیا
پروانۂ فنا و بقا لکھ دیا گیا
اذنِ جزا و حکمِ سزا لکھ دیا گیا
میں نے کہا لکھا؟ تو کہا لکھ دیا گیا

بیداریٔ شعور سے تحقیق یہ ہوا
بیداریٔ شعور ہے اِک دردِ لا دوا
اِس دردِ لا دوا کو دوا لکھ دیا گیا
میں نے کہا لکھا؟ تو کہا لکھ دیا گیا

دیکھ اے دل تباہ! یہ انجامِ ذوق و شوق
پہلے تو پائے شوق کو بخشا سفر کا ذوق
آخر میں مُحکمِ لغزشِ پا لکھ دیا گیا
میں نے کہا لکھا؟ تو کہا لکھ دیا گیا

وہ جو بجائے خود ہے عجائب کی کائنات
اُس کو کہ خِضرِ منزلِ تخلیق جس کی ذات
سالارِ کاروانِ فنا لکھ دیا گیا
میں نے کہا لکھا؟ تو کہا لکھ دیا گیا

وہ نغمۂ حیات ہو یا نوحۂ اجل
اپنے قلم سے ہم نے لکھا دفترِ عمل
اب سب سے پوچھتے ہیں کہ کیا لکھ دیا گیا
میں نے کہا لکھا؟ تو کہا لکھ دیا گیا

منظور تھا جو عالمِ لا کو ظہورِ ذات
تصنیف کر کے دفترِ اسرارِ کائنات
ہر عالمِ ظہور کو لا لکھ دیا گیا
میں نے کہا لکھا؟ تو کہا لکھ دیا گیا

# بحضرتِ یزداں

حالِ بشر بحضرتِ یزداں کہا گیا
پوچھیں ملائکہ تو کہو ہاں کہا گیا
رودادِ بد نصیبی آدم سُنی گئی
افسانۂ خرابی دوراں کہا گیا
علمِ بشر پہ جہل کی پھبتی کسی گئی
دانائے روزگار کو ناداں کہا گیا
مظلوم کُن کو ظلم کے طعنے دیے گئے
فکر و نظر کو جرأت عصیاں کہا گیا
جوہر طرازِ آئنۂ کائنات کو
آئینہ دارِ دیدۂ حیراں کہا گیا
منزل شناسِ مرحلۂ ہست و بود کو
عفریتِ مرگ و غولِ بیاباں کہا گیا

اُف رے ستم طرازیِ قدرت کہ جبر کو
آزادیِ ارادۂ انساں کہا گیا
اُف رے فریب کاریِ خلقت کہ خلق کو
نیرنگِ آفرینشِ دوراں کہا گیا
آبِ بقا میں لُطفِ بقا کیا کہ موت کو
زہرِ غمِ حیات کا درماں کہا گیا
لطفِ حیات کیا کہ نمودِ حیات کو
افسونِ جسم و شعبدۂ جاں کہا گیا
پھر خیر و شر میں فرق کریں بھی تو کس لیے؟
ہر شر کو خیرِ محض کا عنواں کہا گیا
صد حیف اے قبیلۂ عرفان و آگہی!
ہر جہل کو ذریعۂ عرفاں کہا گیا
افسوس اے مجاہدۂ علم و اعتقاد!
ہر وہم کو وسیلۂ ایقاں کہا گیا
اے کفر! ناز کر کہ تجھے بھی بطورِ خاص
من جملۂ لوازمِ ایماں کہا گیا

اے شرک مرحبا کہ تجھے بھی بہ احتیاط
توحید کی حقیقتِ پنہاں کہا گیا
سامانِ صد تجلّی و اسبابِ صد جمال
پھر بھی نظر کو بے سرو ساماں کہا گیا
پیغامِ صد تسلّی و پیمانِ صد وصال
پھر بھی طلب کو مایۂ حرماں کہا گیا
اک قلبِ دردمند کو بخشا گیا جنوں
اک جانِ نامراد کو جاناں کہا گیا
اک حادثے سے ارض کو تشبیہہ دی گئی
اک واہمے کو گنبدِ گرداں کہا گیا
کچھ ذرّہ ہائے خاک کو چُن کر بہ لطف و ناز
ماہِ منیر و مہرِ درخشاں کہا گیا
کچھ قطرہ ہائے آب کو لیکر بہ فیض وجُود
گرداب و بحر و ساحل و طوفاں کہا گیا
تکمیل جب مراحلِ دوزخ کی ہوچکی
ہر مرحلے کو روضۂ رضواں کہا گیا

عبرت کہ ایک بندۂ ایماں سرشت کو
زرتشتیٔ و یہود و مسلماں کہا گیا
حیرت کہ اک مکالمۂ لا کلام کو
سترِ زبور و آیۂ قرآں کہا گیا
لکھنے کو اک صحیفۂ معنیٰ! لکھا گیا
کہنے کو ایک دفترِ عرفاں کہا گیا
لیکن اساسِ علم و خبر معتبر کہاں؟
سب کچھ بہ ذیلِ خوابِ پریشاں کہا گیا

# جبرِ مشیّت

فکر و تدبیر کی طاقت پہ نہ اترا اے دوست!
زندگی جبرِ مشیّت کے سوا کچھ بھی نہیں
تو سمجھتا ہے جسے حرّیتِ جہد و عمل
غیر مشروط اطاعت کے سوا کچھ بھی نہیں
وہ حوادث کہ زمانے کو ہلا دیتے ہیں
بھوک اور بھوک کی شدّت کے سوا کچھ بھی نہیں
باش! اے اشرفِ مخلوق کہ تیرے اندر
گرگ و روباہ کی سیرت کے سوا کچھ بھی نہیں
فکرِ انجام کہاں تک کہ یہ فکرِ انجام!
دیدہ و دل کی عقوبت کے سوا کچھ بھی نہیں
مختصر یہ ہے کہ ہم سب کی حیاتِ فانی
زندہ رہنے کی مشقّت کے سوا کچھ بھی نہیں

# تضادِ بشر

عجب تضادِ بشر ہے خوشا تضادِ بشر
کہ اک بدیعۂ تخلیقِ کائنات مگر
یہ کیا کہ پردہ درِ غیب جس کا ذوقِ شہود
پہنچ سکے پسِ دیوار بھی نہ اُس کی نظر
یہ کیا کہ منزلِ الہام جس کا قلبِ سلیم
وہ اپنے نقشِ کفِ پا کی پا سکے نہ خبر
یہ کیا کہ عالمِ ارواح جس کی جولاں گاہ
خود اپنے کشورِ تن میں نہ کر سکے وہ گزر
یہ کیا کہ لشکرِ اجسام کا جو میرِ سپاہ
خود اپنے جسم کے زنداں میں ڈال دے وہ سپر
یہ کیا تضادِ بشر؟
یہ کیا تضادِ بشر ہے؟ یہ کیا تضادِ بشر؟

ازل سے جس کی کفِ خاک میں ابد کا فروغ
خود اُس کا شعلۂ ہستی بقدرِ رقصِ شرر
فتوحِ انفس و آفاق پر جو قادر ہو
خود اپنے نفس میں پائے نہ کوئی روزنِ در
نفوذ ذہنِ حقائق کا اِدعا جس کو
خود اپنے آپ سے گزرے تو کر سکے نہ گزر
یہ کیا کہ فاتح ابواب کائنات جو ذہن
خود اپنے خول میں سمٹا ہوا بہ خوف و خطر
یہ کیا تضادِ بشر؟
یہ کیا تضادِ بشر ہے؟ یہ کیا تضادِ بشر؟
جو حکم رانِ قضا و قدر کہے خود کو
عجب کہ حکمِ قضا سے نہیں خود اُس کو مفر
حکیمِ علمِ عناصر جو زندۂ جاوید
خود اختلالِ عناصر سے اُس کی جاں کو ضرر
جو نکتہ دانِ حدوث و قِدم بہ علمِ قدیم
عجب کہ اپنے حوادث سے آپ ہی مضطر

فشارِ غم سے ہوئی جس کے ذہن کی تشکیل
وہ تاب لا نہ سکے نیش غم کی ایک پہر
جو خونِ دل سے لکھے سرگذشتِ مستقبل
خود اپنے حال سے غافل، زہے کمالِ خبر
وہ جس کے نفس میں مضمر علومِ ارض وسما
خود اپنے علم سے عاجز، زہے بلوغِ نظر

یہ کیا تضاد بشر؟

یہ کیا تضاد بشر ہے؟ یہ کیا تضاد بشر؟
ستارے جس کے لئے آسماں پہ چشم براہ
نشیبِ ارض میں اُس کو قدم قدم پہ خطر
عجب کہ خاک پہ درماندۂ نشیب وفراز
وہ جس کے زیرِ قدم جبرئیل کے شہپر
عجب کہ فرشِ زمیں پر اسیرِ پست و بلند
وہ جس کی فکرِ رسا کا مقام گردوں پر
نگاہ جس کی ہو پردہ کشائے نورِ سما
حجابِ تیرۂ ارض اُس کو اک حجابِ نظر

شگافِ سینۂ ذرّات میں سما جائے؟
وہی کہ جس میں غروب اک جہانِ شمس و قمر
سوادِ ظلمتِ شب میں بھٹک کے رہ جائے؟
وہی کہ جس کی جبیں سے طلوع نورِ سحر
یہ کیا تضادِ بشر؟
یہ کیا تضادِ بشر ہے؟ یہ کیا تضادِ بشر؟
وہی کہ وسعتِ کون و مکاں میں تھا دل تنگ!
یہ کس کی قبر ہے اے زائرینِ خاک بسر
وہی کہ عرصۂ افلاک میں تھا بال کشا!
یہ کس کی خاک ہے اے گردِ بادِ راہ گزر
وہی کہ خلعتِ گُل جس کا جامۂ صد رنگ!
یہ کس کا پیکرِ بے رنگ ہے تہِ چادر
وہی کہ عطرِ چمن جس کی نکہتِ انفاس!
یہ کس کی بوئے پریشاں ہے اے نسیمِ سحر؟
یہ کون ہے کہ ہے راہِ طلب میں آوارہ؟
وہی کہ جس کی طرف کائنات گرمِ سفر!

یہ کون ہے کہ ہے خوفِ اجل سے آزردہ؟
وہی کہ جس میں حیاتِ دوام کے جوہر!
یہ کیا تضاد بشر؟
یہ کیا تضادِ بشر ہے ؟ یہ کیا تضادِ بشر؟
وہی کہ صاحب دل ہے وہ یوں بہ قلبِ فگار!
وہی کہ جانِ جہاں ہے وہ یوں بدیدۂ تر؟
وہی کہ نازش کُن ہے وہ یوں کمینۂ خلق!
وہی کہ اہلِ نظر ہے وہ یوں ستم کشِ زر!
یہ کیا تضاد بشر؟
یہ کیا تضاد بشر ہے ؟ یہ کیا تضاد بشر؟
یہ کیا تضاد بشر؟

# توہّم

نہ لہریں ہیں نہ گرداب و تلاطُم
یہ دریا اپنی گہرائی میں ہے گُم
تمہاری جستجو سے فائدہ کیا
کہ خود میری طرح معدوم ہو تم
تو پھر کس کے لئے کس کے لئے ہے؟
یہ میری روح میں بر پا تلاطم
نگاہیں اور کس کو ڈھونڈتی ہیں
یہ آخر ماورائے ماہ و انجم
نہ جانے کس کی ذاتِ خاص سے ہوں
یہ بے لفظ و بیاں محوِ تکلّم
نہ جانے کس کی بزمِ راز میں ہوں
یہ بے ساز و نوا گرمِ ترنّم!
یہ خندہ آفریں ہے کون آخر؟
کہ مجبوراً ہوں مصروفِ تبسّم

مجھ سے شورشِ ہستی عبارت
میں خود ہی شورشِ ہستی میں ہوں گم
یہاں سارے توہّم ہیں تفکّر
یہاں سارے تفکّر ہیں توہّم

جب بھی ورائے راہ گزر دیکھتا ہوں میں
منزل کو گردِ راہِ سفر دیکھتا ہوں میں
ہر چہرہ ہے نویدِ تبسّم مرے لیے
ہر شخص کو بدیدۂ تر دیکھتا ہوں میں
سورج کی ہر کرن میں سرایت کیے ہوئے
نازک سی ایک موجِ نظر دیکھتا ہوں میں
تم دیکھتے ہو نقش و نگارِ جمالِ دوست
آرائشِ جمالِ ہنر دیکھتا ہوں میں
کیا شکوۂ قفس کہ خود اپنے کو اے رئیسؔ
فرسودہ بال و ریختہ پر دیکھتا ہوں میں

# جراحتِ تخلیق

نہ وجود و عدم نہ غیب و حضور
وقت میں بہہ رہی ہے موجِ شعور
وقت آسودۂ دوام و بقا
وقت آزردۂ سنین و شہور
لاکھ ہوں بے نقاب شمس و قمر
وقت اپنے حجاب میں مستور
وقت معیارِ غم بہ عیارِ حیات
وقت میزانِ کیف و وزنِ سرور
وقت آئینِ غیب و مستوری
وقت آئینۂ جمال و ظہور
وقت ہے رازدانِ خلوتِ روح
وقت ہے ترجمانِ جلوتِ نور
ذات ہے ذات کی طرف مائل
واپسی کا سفر ہے منزل دور

آج تک ہے جراحتِ تخلیق
سینۂ کائنات کا ناسُور!
منزلیں اپنی راہ میں جولاں
قافلے اپنی گرد میں مستور

نہ سُن مجھ کو کہ دُور از کار ہوں میں
نشیدِ نغمۂ اسرار ہوں میں
شہادت کی زباں ہے بے زبانی
قتیلِ فتنۂ گفتار ہوں میں
ادھر آ! رہروِ گم کردہ منزل
چراغِ جادۂ افکار ہوں میں

# وقت

دیکھ تو وقت کی عظمت باقیہ!
ساقیا ساقیا ساقیا ساقیا !
وقت کیا؟ اک یم بے حد وبے کراں!
جاوداں جاوداں جاوداں جاوداں
وقت فی الحال و فی عہد اسلافنا
لافنا لافنا لافنا لافنا
وقت اَمرِ ابد وقت اصلِ ازل
لَم یَزَل لَم یزل لَم یَزَل لَم یزَل
وقت کیا؟ وقت ہے تیز دو گرم رَو
نوبہ نو، نوبہ نو، نوبہ نو، نوبہ نو
وقت کیا؟ کوئی جس کی تحدّی نہ حد
لاعدد لاعدد لاعدد لاعدد

وقت بے نام و بے نوبت و بے جہت
وقت بے شرح و بے شارح و بے صفت
وقت کی انتہا وقت کی ابتدا
وقت لا ابتدا وقت لا انتہا!
وقت بے شکل و بے منظر و بے نشاں
وقت بے ظرف و بے صورت و بے مکاں
وقت میں این و آں وقت میں اب جب
وقت بے طالب و مطلب و بے طلب
خود کفیل و خود افروز و خود مکتفی
وقت کیا؟ وقت صرف ایک سرِ خفی
وقت ہی غرب ہے وقت ہی شرق ہے
وقت خود قلزم وقت میں غرق ہے
وقت اک رُوحِ باقی و جاوید ہے
وقت اک حسنِ پیدا و ناپید ہے
وقت اک قرن اِک سال اِک دن نہیں
وقت کی کوئی تشریح ممکن نہیں

زندگی صید ہے وقت صیاد ہے
وقت کی قید سے کون آزاد ہے؟
حدِّ شام و قیودِ سحر سے بری
وقت ہے کہنہ و تازہ تر سے بری
وقت کو ظرف کا آفریدہ نہ کہہ
وقت پیمانۂ گردشِ مہر و مہ
وقت کیا؟ جلوۂ کائنات آفریں
کائنات اور کیا ہے؟ اگر یہ نہیں
وقت میں انحطاط اور نہ کچھ ارتقا
وقت کا حادثہ ہے فنا و بقا
وقت کیا قلزمِ راز کی لہر ہے
وقت والعصر ہے وقت الدہر ہے
کون سمجھے بھلا عالمِ کیف و کم
وقت کے رازہائے حدوث و قِدَم
یہ حقیقت ہے اک محکم و ثابتہ
وقت حادث سہی پر نہیں حادثہ

لیکن اس بحث میں ایک "لیکن" بھی ہے
وقت حادث بھی ہے وقت ممکن بھی ہے
یہ وسیلہ ہے ادراک و احساس کا
اِس سے عرفان اشیاء و انفاس کا
عالِم وقت کا کوئی محرم نہیں
وقت کے ماسوا کوئی عالم نہیں
قرن و عشر و صدی و مہ و سال کیا؟
وقت ہی وقت ہے ماضی و حال کیا
امتیاز وجود و عدم وقت سے
ہم جو اپنے کو کہتے ہیں ہم وقت سے
دہر میں کس کو جرأت ہے تحقیق کی؟
وقت کنجی ہے اسرارِ تخلیق کی

اگر شعور نہ خضرِ طریق ہو تو حیات
غنودگی میں سفر کے سوا کچھ اور نہیں

# آفرینش نامہ

پہلے اک نغمۂ بے نغمہ و سازِ بے ساز
پھر کہیں غلغلۂ صوت و سرود و آواز
پہلے اک جلوۂ بے جلوہ و رنگِ بے رنگ
پھر کہیں مرحلۂ حسن و فروغ آہنگ
پہلے اک جذبۂ بے جذبہ و سوزِ بے سوز
پھر کہیں ولولۂ شوق و غمِ جاں افروز
پہلے اک لہجۂ بے لہجہ و پیرایۂ راز
پھر کہیں تذکرۂ ناز و حکایاتِ نیاز
پہلے اک ولولۂ ناز بہ اندازِ کمال
پھر کہیں قامتِ بالا و سراپائے جمال
پہلے اک شیوۂ مبہم کہ توجہ نہ گریز
پھر کہیں چشمِ عتاب و نگہِ لطف آمیز

پہلے اک عشق کہ ہر ذوقِ طلب سے بیزار
پھر کہیں یہ طلبِ جلوہ و شوقِ دیدار
پہلے اک جذبۂ بالیدگی و ذوقِ نمو
پھر کہیں تابشِ رخسارہ و تابِ گیسو
پہلے اک روشنیِ نکہت و رعنائیِ رنگ
پھر کہیں جلوۂ خوشبو و خود آرائیِ رنگ
پہلے بیداریِ اصوات ۔ پسِ پردۂ ساز
پھر کہیں زمزمۂ وحی و سروشِ اعجاز
پہلے اک گنجِ گراں مایۂ اسرارِ نہاں
پھر کہیں شرحِ عبارات و تفاصیل و بیاں
پہلے اک معنیِ بے لفظ و کلامِ بے حرف
پھر کہیں نحو و بیان و ادب و منطق و صرف
پہلے اک مادۂ محض کہ جوہر نہ عَرَض
پھر کہیں صورت و شکل و سبب و قصد و غرض
پہلے اک عصر کہ خود عصر ہیں مصروفِ سفر
پھر کہیں روز و شب و سال و مہ و شام و سحر

پہلے اک ظرف کہ خود ظرف میں مستور و نہاں
پھر یہ سمت و جہت و تمکنتِ کون و مکاں
پہلے اِک شے فقط و مطلق و محض و معیار
پھر یہ عَرض و عُمق و طول و متاع و مقدار
پہلے اک سادہ حقیقت کہ حقائق سے بلند
پھر کہیں ردّ و کد و شرح و بیان و چہ و چند
پہلے اک فکرِ مجرّد کہ نہ مخصوص نہ عام
پھر کہیں فلسفہ و منطق و تحقیق و کلام
پہلے اک واجبِ مطلق کہ نہ حادث نہ قدیم
پھر حدوث و قِدم و عین و خصوص و تعمیم
پہلے اک علّتِ اولیٰ کہ نتیجہ نہ عمل
پھر کہیں ضدّ و ثبوت و سند و بحث و جدل
پہلے اک قصد شباں گاہی و آہنگِ سحر
پھر کہیں مشتری و زہرہ و خورشید و قمر
پہلے اک دائرہ نور و محیطِ انوار!
پھر کہیں ثابت و سیّارہ و دَور و دَوّار

پہلے اک نقطۂ جذب وکشش واخذ وقبول
پھر کہیں نظمِ نظام ومحلِ وصل و وصول
پہلے اک حال کہ اخفا نہ تقاضائے نمود
پھر کہیں مرحلۂ غیب وتمنائے شہود

شہیدِ لفظ سکوت اختیار کر کہ یہاں
سخن ؔو کمالِ سخن کے سوا کچھ اور بھی ہے
وہ دیکھ گوشۂ پر خار و تودۂ پرُخاک
چمن میں صحنِ چمن کے سوا کچھ اور بھی ہے
حیات صرف تن آسانی و طرب ہی نہیں
یہاں لذائذِ تن کے سوا کچھ اور بھی ہے

# اوّلیں شعاع!

مہرِ جہاں فروز کی وہ اوّلیں شعاع
تجدید و تازہ کاری و ایجاد و اختراع
تخلیق کی متاع
وہ اوّلیں شعاع
مہرِ جہاں فروز کی وہ اوّلیں شعاع
وہ اوّلیں شعاع

تاریکیٔ عدم میں وہ تابانیٔ ظہور
پیغمبرِ جمال و رسالت مآبِ نور
اِلہامِ آفرینش و بیداری وشعور
ہیئت گرِ سنین و رصد خانۂ شہور
عہد آفریں شعاع
وہ اوّلیں شعاع

مہرِ جہاں فروز کی وہ اوّلیں شعاع
وہ اوّلیں شعاع
نوخیز و نرم و نازک و نوفکر و نوجواں
اخترشناسِ مہر و نجومیٔ کہکشاں!
افلاک کی نقیب ستاروں کی ترجماں
میزانِ ہر زمان و ترازوئے ہر مکاں
ایجاد و اختراع
وہ اوّلیں شعاع
مہرِ جہاں فروز کی وہ اوّلیں شعاع
وہ اوّلیں شعاع
آئی وجود میں عدم بے پناہ سے
پہنچی ظہور تک ابدیت کی راہ سے
گزری رواروی میں ہر اک جلوہ گاہ سے
سیّارہ و ثوابت و خورشید و ماہ سے
ہوتی ہوئی وداع
وہ اوّلیں شعاع!

مہرِ جہاں فروز کی وہ اولیں شعاع
وہ اوّلیں شعاع!
اِس نیلگوں طلسم کی وہ سیم گوں پری
میرِ سپاہِ زہرہ و ناہید ۔ مشتری
پہنائے کائنات میں کرکے شناوری!
اتری ہے پستیوں میں بصدِ شانِ دلبری
وہ نازنیں شعاع
وہ اولیں شعاع
مہرِ جہاں فروز کی وہ اوّلیں شعاع
وہ اوّلیں شعاع
برق و شرار و شعلہ وسوز و دخان و دُود
ویرانۂ حیات میں معمارِ ہست و بُود
صنّاعِ کون ۔ صانعِ کُن صنعتِ وجود
دنیائے بے نمود میں اِک مژدۂ نمود
پُر نور اطّلاع!
وہ اولیں شعاع!

مہرِ جہاں فروز کی وہ اوّلیں شعاع
وہ اوّلیں شعاع
رفتارِ صوت، جُنبشِ امواج، سَیلِ نور
تحریک، ارتقا و توانائی و شعور
اعصار کا شہود تو ادوار کا ظہور
ہر منزلِ وجود سے کرتی ہوئی عبور
بے قید و امتناع
وہ اوّلیں شعاع!

# عدم

اک حقیقت لا تعیّن اک تعیّن بے مثال
اک تصوّر لا تصوّر اک تخیّل بے خیال
اک نہایت لانہایت اک تعدّد لا حدود
اک تفکّر لاتفکّر اک تجدّد لا وجُود
وہ تہی دستی کہ جس کی دسترس میں بید رنگ
اَن گنت سیّارہ ہائے نور و جنّت ہائے رنگ
وہ زیاں کاری کہ ہر سُود و زیاں سے بے نیاز
وہ زبوں حالی کہ خود اسبابِ صد سامانِ ناز
اسم بے زارِ مسمّیٰ ہے نام محرومِ نشاں
اختیارِ بے تصرّف احتمالِ بے گماں!
وہ خلائے محض جس کی وسعتوں میں بے شمار
کائناتِ کائنات و روزگارِ روزگار

ایک اَمرِ بے اولی الا مر اک ورائے ماورا
اک مُرادِ بے ارادہ اک سوائے ماسوا
قصد بے سمتِ تعیّن سمت بے قصدِ جہات
ایک ذاتِ بے تعلق، ایک وصفِ لاصفات
ایک دریا بے تلاطم ایک دنیا بے ظہور
ایک نشر بے قیامت ایک حشر بے نشور
شامِ حیرت۔ بے ابد صبحِ تفکّر بے ازل
وہ ازل ہا در تسلسل وہ ابد ہا در بغل
ایک ضبطِ بے محابا، ایک نظمِ بے نظام
فکر ماقبلِ تفکّر نطق مافوقِ کلام
کوئی آن دیکھی تجلی کوئی آن جانی امنگ
اِک نوا بے ساز و نغمہ اک ادا بے حسن و رنگ
غیب خود جس کے مظاہر سے ہراساں وہ ظہور
عقل خود جس کے تصوّر سے گریزاں وہ شعور
حسن خود جس کو پرکھ سکتا نہیں ایسا جمال
عشق خود جس کو سمجھ سکتا نہیں ایسا وصال

ہجر جس کے پیچ و خم میں مبتلا ایسا فراق
شوق کو خود جس کا اندازہ نہیں وہ اشتیاق
وہ خِفا جس کی سرشت ابراز و اظہار و نمود
وہ عَدم جس کا خمیر آغشتۂ ذوقِ وجود
جہل ایسا جہل جو ہر علم کا سرمایہ دار
نیند ایسی نیند بیداری کا جس سے اعتبار
مادّہ ایسا کہ بے تخصیصِ میعاد و مواد
کَون ایسا کَون جو آزادِ تکوین و فساد
اِک زماں بیگانۂ لیل و نہار و ماہ و سال
اِک مکاں لا انتہا و لا حدود و لا مثال
کوئی ایسی چیز ایسا واقعہ ایسا وجود
جوہرِ کون و مکاں جس کی نمودِ بے نمود
ایک حق جس کو کوئی نسبت نہ ہو تحقیق سے
ایک خالق جو ابھی واقف نہیں تخلیق سے
آفرینش کا اک آئینِ عمل ہر آئینہ
ہشت پہلو لعل و گوہر ہفت جوہر آئینہ

ایک جوہر جلوہ آرا اک عَرَض صورت پذیر
ایک نفس مطمئنہ انفس و آفاق گیر
کیفیت بے شکل وصورت کمیّت بے کیف و کم
وہ عدم اندر عدم اندر عدم اندر عدم
حاصل اشیاء جو شے آبستن الّا جو لا
وہ خلاء اندر خلاء اندر خلاء اندر خلاء

کوئی اے ناخدا! یہ ڈوبنے والوں کو بتلا دے
کہ جو طوفاں میں کھو جاتے ہیں ساحل پر نکلتے ہیں
نئی کلیاں چٹکتی ہیں اُدھر شاخ گلستاں پر
اِدھر کچھ طائران ناتواں کے پر نکلتے ہیں
یہ میری اشک افشانی بھی اِک طرفہ تماشا ہے
کبھی آنسو ٹپکتے ہیں کبھی گوہر نکلتے ہیں!
خمارِ شوق کی یہ مست رفتاری ارے توبہ
زمانے کو یہ دھوکا ہے کہ ہم پی کر نکلتے ہیں
پڑھے کیوں کر کوئی اِس دفترِ تہذیب انساں کو
ورق اکثر کتابوں کے لہو میں تر نکلتے ہیں

# فردِ حساب

کُھل رہی ہے غمِ جہاں کی کتاب
پڑھ رہا ہوں خود اپنی زیست کا باب
ایک ایسی زباں میں لکھی ہے
کاتبِ غیب نے یہ فردِ حساب
جس کے خطّ و حروف و معنیٰ کی
ابتدا اور انتہا نایاب
اِسی خط میں لکھے گئے ہوں گے
زندگی کے نوشتہ ہائے عذاب
یہ زباں قبلِ آفرینش کی
کلمۂ جس میں ہے نہ کُن کا خِطاب
نہ تکلّم نہ تکملہ نہ کلام
نہ کتابت نہ مکتبہ نہ کتاب
یہ زباں حرف و لفظ میں نادِر
یہ زباں شرح و نُطق میں کمیاب

ہاں اِسی اجنبی زباں میں کہے
دلِ بیدار نے بہ عالمِ خواب
ابدیّت سے کچھ سلام و پیام
احدیّت سے کچھ سوال وجواب

قانعِ حسرت، کہ نازِ آرزو باقی نہیں
اب مرے دل میں گدازِ آرزو باقی نہیں
اب نظر آتے نہیں رنگین دنیاؤں کے خواب
زندگی کی سخت کوشی ہے نظریں بے حجاب
اب مجھے نسبت نہیں رنگینیِ گلزار سے
میں چمن میں کھیلتا رہتا ہوں نوکِ خار سے
عشقِ دیوانہ کہاں عشقِ مشقت جو کہاں
اے مرے معصوم ساتھی! میں کہاں اور تو کہاں

# انسانِ کبیر

زیست جہدِ ناگریز و ناگزیر
تیشۂ خارا شکن بے جوئے شیر
فکرِ آدم نرم سیر و سخت جاں
ذہنِ یزداں گرم کار و سخت گیر
آفرینش کا عمل کتنا عظیم!
آفرینش کا محل کتنا حقیر!
تنگنائے مقصدِ تخلیق میں
مُشتِ خاکِ آدمی وسعت پذیر
مشتِ خاکِ آدمی کی سرگذشت
جدّوجہد و جَست خیز و داروگیر
جانِ آزادِ قیودِ مرگ و زیست
جسم زندانِ زمانہ میں اسیر
ارتقائے زندگی کا راستہ
کہکشاں وار ایک پیچیدہ لکیر

نقش ہائے رنگ رنگِ کائنات
کائناتِ رنگ رنگِ دل پذیر
نقشِ اوّل ایک تیرہ خاکداں
نقشِ آخر ایک انسانِ کبیر

جہاں نورِ سحر پایا نہ شب میں چاندنی دیکھی
تعجب ہے کہ اُس گھر میں بھی اکثر روشنی دیکھی
انہیں جن کو نہ ہم آزردہ خاطر دیکھ سکتے تھے
بہت آزردہ دیکھا اور بہت آزردگی دیکھی
مزاجِ دوست میں اب تک ہزاروں انقلاب آئے
مگر اپنی جو حالت تھی ہمیشہ سے وہی دیکھی
محبت کا یہ اعجازِ سخن گوئی قیامت ہے
نظر میں گفتگو پائی لبوں پر خامشی دیکھی
مجھے بے ساختہ یاد آگئی عہد بہاراں کی
فضا میں جب کبھی برقِ حوادث کوندتی دیکھی

# تقدیر

ہر ذرّہٗ تیرگی و تنویر
زندانیٔ کائناتِ تقدیر
انجم ہیں خلاء میں پابجولاں
سورج ہے زمیں سے پابہ زنجیر
رقصاں ہیں شعاعِ مہر کے ساتھ
ذرّات زمیں بہ نوک شمشیر
ذرّات پہ رقص کررہی ہے
سورج کی کرن بجبرِ تنویر
منظور ہے کاہ کی کشش سے
افلاک پہ کہکشاں کی تسخیر
یہ معرکہ نشو و ارتقا کا
شاخیں ہیں کماں تو پھول ہیں تیر
اے میرے وجود کے مصوّر!
میں تیرے وجود کی ہوں تصویر

با ایں ہمہ جذب و شوق اے دوست
کیا قرب و وصال کی ہو تدبیر
تو روح کا جلوۂ جہاں تاب
میں جسم کا سایۂ زمیں گیر

گل خجل، غنچہ خفا، گلچیں پشیماں ہوگیا!
اے قبائے رنگ! کس کا جسم عریاں ہوگیا!
نا خدا! اب مجھ کو طوفانِ بلا سے کیا خطر
ڈوب کر میں شاملِ اجزائے طوفاں ہوگیا
ہم اُسے جلوہ سمجھتے ہیں جو ہو آئینہ ساز
ہم اسے آئینہ کہتے ہیں جو حیراں ہوگیا
جب کسی قطرے کو لہر آئی بنا طوفاں بدوش
جب کسی ذرّے نے کروٹ لی بیاباں ہوگیا
گُل ہوا کرتے تھے پہلے میرے دامن سے چراغ
رفتہ رفتہ خود چراغِ زیرِ داماں ہوگیا

# ہیولے

رات آئے تھے میری خلوت میں
آدمی زاد قبلِ آدم کے
جیسے خواب و خیال کے سائے
یا ہیوُلے قیاسِ مُبہم کے
کچھ عجیب و غریب مجموُعے
آتش و خاک و صرصر ونم کے
کچھ مہیب و محال سے منظر
ابتدائے ظہوُرِ عالم کے
چند آوارہ گرد سے نقشے
ایک تخلیقِ نا منظّم کے
سخت حسّاس سخت نامحسوس
شعبدے جسمِ نامجسّم کے
ظلمتوں کے لبَاس میں ملبوُس
شعلے ترشے ہوُئے جہنّم کے

کانپتی تھیں مرے تصوّر میں
کچھ لکیریں دُھوئیں کی تھم تھم کے
جھلملاتے تھے اِس طرح چہرے
اُن کی افسوں گریِ پیہم سے
جس طرح سلسلہ شہابوں کا
ابرِ تیرہ کی اوٹ سے چمکے
کہکشانوں کے پیچ و خم پہ محیط
سلسلے اُن کی زلفِ برہم کے
ہاں وہ موہوم اوّلیں خاکے
مُشتِ خاکسترِ دو عالم کے
یوں مری خلوتوں میں دَر آئے
جس طرح پیکِ مرگ آدھمکے
چھڑ گئے اجنبی ہیولوں سے
تذکرے ابتدائے عالم کے
میں نے جب ان سے یہ سوال کیا
تم ہو محرم ہر ایک محرم کے

قبلِ تاریخ بوالبشر کیا تھے
رنگ اِس کارگاہِ عالم کے
ایک سائے نے یہ جواب دیا
صرف آدم تھا قبل آدم کے

اک ساتھ دو ادائیں بخشی گئی ہیں مجھ کو
موضوعِ عارفانہ، وضع قلندرانہ
تہذیب دیدہ و دل بے سوزِ جاں نہیں ہے
یا عقلِ والہانہ یا عشق والہانہ

دل اُن کے حلقۂ زلفِ دوتا سے چھوٹ گیا
بلا سے چھوٹ گیا ابتلا سے چھوٹ گیا

# عفریت اور دیوتا

جی میں آتا ہے شہر میں گھوموں
اور کوئی مجھے نہ پہچانے
خوف و دہشت سے لوگ دہرائیں
میری جادوگری کے افسانے
یوں مرے جسم وجاں ہوں پُراسرار
یوں مرے خال و خد ہوں انجانے
جیسے میرے وجُود میں مدفون
گُم شدہ مقبروں کے تہ خانے
جیسے میرے غبار میں ملبوُس
موت کی وادیوں کے ویرانے

جی میں آتا ہے شہر میں گھوموں
اور کوئی مجھے نہ پہچانے!

توڑ ڈالے ہوں اِس طرح میں نے
شخصیت کے تمام پیمانے
کہ مری ذات کے دُھندلکے میں
کوئی جھانکے تو کچھ نہ پہچانے
میرے ویرانۂ سراغ میں گم
لاکھ دانا ھزار دیوانے
کوئی سمجھے فرشتۂ ارواح
کوئی آوارہ گرد گردانے
بے محابا مسافروں کی طرح!
گشت کرتے ہوں میرے افسانے
داستانوں کے ڈھیر لگ جائیں
گر کوئی میری خاکِ پا چھلنے
چھانٹ رکھے ہوں میری وحشت نے
شہر و صحرا میں دو ہی کاشانے
اوّل صبح چند گورستان!
آخرِ شام چند مے خانے

جی میں آتا ہے شہر میں گھوموں
اور کوئی مجھے نہ پہچانے
شہر یار و امیر و میر و فقیر
کون کیا ہے مری بلا جانے؟
میں ہوں یارانِ شہر سے بیزار
مجھ سے یارانِ شہر بیگانے
میری حد تک حدودِ ممنوعہ
مسجدیں، مدرسے، صنم خانے
یوں گریزاں ہوں میرے سائے سے
شہرِ علم و ہنر کے فرزانے
جیسے طوقِ گلو سے دانش مند
جیسے زنجیرِ پا سے دیوانے
جی میں آتا ہے شہر میں گھوموں
اور کوئی مجھے نہ پہچانے
لیکن اِس شہرِ نامراد سے دور
وہ جو ٹیلے ہیں جانے پہچانے

ایک معدوم قوم کا مسکن!
قبلِ تاریخ کے یہ ویرانے
یہ پُر اسرار عالمِ ارواح !
آدمِ اوّلیں کے کاشانے
اِنھی ٹیلوں میں ایک ٹیلے پر
کب سے ؟ کس عہد سے ؟ خدا جانے
ایک سایہ سا کانپتا ہے کبھی
ابدیت کی برچھیاں تانے
یہ ہے تاریخِ عقل کا عفریت
اہلِ دانش ہیں جس کے دیوانے
یہی عفریتِ دوزخی اے کاش
مجھ کو معصوم دیوتا مانے

# نفسیاتِ جدید

اے بزرگانِ نفسیاتِ جدید
آپ ہیں محرمانِ رازِ شعور
نفسِ انساں کے مختلف پہلو
آپ کی آنکھ سے نہیں مستور
آدمی زاد ، نوری و ناری
نصف اگر نار ہے تو نصف ہے نور
جنس و جذب و جبلّت و کردار
لاشعور و شعور و تحتِ شعور
سب پہ ہے آپ کی نگاہِ عمیق
آپ سے کوئی شے نہیں مستور
صرف تکمیلِ ذات ہے مقصد
صرف تحقیقِ نفس ہے منظور

آج سے قبل ذہن کے امراض
سمجھے جاتے تھے لا علاج فتور
نفسیاتی مریض آج سے قبل
کتنے محتاج ؟ کس قدر مجبور؟
سمجھے جاتے تھے مجرم و مجنوں
پابہ زنجیرا قید میں محصور
زندہ درگور اپنی دنیا میں
جاں بلب تھے معاشرے سے دور
لیکن انجامِ کار اہلِ نظر
پا گئے رازِ خاطرِ معذور
طبِ نفسی ہے آج کل وہ طب
جس پہ نازاں ہے عہدِ نو کا شعور
عہدِ نو نفسیات کا ہے عہد
یہ حقیقت نہیں ہے فہم سے دور
تاہم افسوس اور صد افسوس
اکثریت ہے جہل پر مغرور

بھوت آسیب ٹوٹکے جادو
سحر و افسوں و ساحر و مسحور
آج بھی ہے اناڑیوں کا ہجوم
آج بھی ہے عطائیوں کا وفور
سحر و افسوں کی کیا حقیقت ہے؟
یہ مسائل کچھ اور ہی ہیں حضور
آپ ہیں صاحبانِ فکر و نظر
ہو گزارش رئیسؔ کی منظور
عہدِ تازہ کی نفسیات کے ساتھ
علمِ کہنہ پہ بھی نظر ہو ضرور
بوعلیؔ و غزالیؔ و رومیؔ!
اور سقراطؔ و سرمدؔ و منصورؔ
سب کی تحقیقِ تازہ ہے لازم
اور تحقیق کا جدید شعور

# بقولِ شیخ

کل اک جنیدِ وقت کی محفل میں اے رئیس
میں حسنِ اتفاق سے تھا حاشیہ نشیں
اک بے کنار بحرِ طریقت سے فیضیاب
اک بے خزاں ریاض ہدایت میں خوشہ چیں
صف بستہ چار سو تھے مریدانِ سادہ لوح
حضرت مقامِ رشد و ہدایت پہ جاگزیں
کیا کیا سوالِ راز تھے کیا کیا جوابِ ناز!
میں سر بہ سرِ چُناں تھا وہ سرتا بپا چُنیں
فرصت اِس این و آں میں کہاں تھی درِ کلام
احقر کے لب پہ آں تھا تو حضرت کے لب پہ ایں
میرا سوال درجۂ علم و خبر ہے کیا
ان کا جواب علم کہیں ہے خبر کہیں

میں نے کہا کہ دانشِ حاضر کے معجزے؟
کہنے لگے کہ شعبدۂ منکرانِ دیں!
پوچھا کہ یہ ثقافتِ انساں کا ارتقا؟
بولے کہ اک مغالطۂ جہل آفریں
میں نے کہا کہ قوتِ تسخیرِ برق و باد
بولے کہ برق و باد کہیں مستند نہیں
پوچھا گیا کہ قوتِ جوہر کا انفجار؟
کہنے لگے کہ اِس کا کوئی جوہری نہیں
میں نے کہا کہ عالمِ بالا کا انکشاف؟
کہنے لگے کہ ہم پہ یہ شے منکشف نہیں
میں نے کہا مشین کا یہ عہدِ برق رو؟
کہنے لگے شرارتِ مخلوقِ آتشیں
میں نے کہا کہ عقل کو نصرت سے اتصال
جھنجھلا گئے کہ عقل ہزیمت سے ہے حزیں
بندے کو ضد کہ مرکزِ سیارگاں ہے شمس
حضرت کو کد کہ محورِ شمس و قمر زمیں

میں نے کہا کہ نفس کے دھوکے جنون وجذب
کہنے لگے کہ نفس کے دھوکے ہیں دلنشیں
احقر کا احتجاج کہ باطل ہے کفرِ جہل
حضرت کا اجتہاد کہ یہ بھی ہے عینِ دیں
میرا یہ اعتراف کہ انساں ہے نازِ خلق
حضرت کا انکشاف کہ شیطان ہے لعیں
احقر کو ضد کہ نازشِ فطرت نژادِ نو
حضرت کو کَد کہ صرف بزرگانِ اوّلیں
میں نے کہا شعور ہے معیار صدق وکذب
کہنے لگے کہ صدق ہے خود کذب آفریں
کیا چیز ہے وسیلۂ عرفانِ کائنات
میں نے کہا کہ علم تو کہنے لگے نہیں
کیا چیز ہے ذریعۂ تہذیبِ عقل ونفس
میں نے کہا کہ عقل تو بولے بھلا کہیں
میں نے کہا سبیلِ ہدایت ہے راہِ جہد
بولے کہ اِحتمالِ ضلالت بھی ہے وہیں

میں نے کہا کہ حشر تو کہنے لگے "یہی"
میں نے کہا کہ نشر! تو گویا ہوئے "یہیں"
میں نے کہا کہ صحبتِ دانا متاعِ فقر
بولے کہ نازِ مطرب و ساقیِ نازنین!
میں نے کہا مشیّت حق ہے بنائے حکم
کہنے لگے کہ مصلحتِ مُرشدانِ دیں!
میں نے کہا کہ چشمِ حقیقت ہے عینِ حق
کہنے لگے کہ دیدۂ غفلت ہے دوربیں
پوچھا کہ یہ محاسبۂ نفس خود فریب
کہنے لگے کہ شیوۂ کفّار و مشرکیں!
میں نے کہا کہ عارفِ حق ہے گروہِ علم
بولے کہ صرف طائفۂ خانقہ نشیں!
کیا ارتقا پذیر نہیں ملّتِ بشر؟
میں نے کہا ضرور ہے کہنے لگے نہیں
عدلِ معاشری و مساواتِ مجلسی
میں نے کہا کہ حق ہے تو بولے خلافِ دیں

پوچھا کہ یہ امارت و عسرت کا امتیاز
گویا ہوئے کہ اپنے لئے حجّتِ مبیں
پوچھا کہ یہ ملوکیّتِ تازہ کا نظام!
بولے کہ اِک وراثتِ شاہانِ حق گزیں
میں نے کہا کہ اصلِ تصوف صفائے قلب
بولے کہ رقصِ مستیٔ و ساقی و ساتگیں
میں نے کہا کہ باطل و حق ہیں جدا جدا
کہنے لگے کہ باطل و حق منفصل نہیں
القصّہ میں تھا علم کا حامی بہ ضدِّ جہل
وہ مدّعیٔ وہم و گماں تھے بصد یقیں
اک بایزیدِ عصر سے میرا مقابلہ
فریاد اے جماعت اقطاب و مُرسلیں!
رندانِ خانقاہ ہی اب فیصلہ کریں!
میں ترجمانِ دیں ہوں کہ وہ ترجمانِ دیں؟

# مرزا غالبؔ

مرزا غالب سے باز دید اپنی
عالمِ خواب میں ہوئی کل رات
اسد اللہ خان ، غالبِ وقت
اللہ اللہ وہ رندِ خوش اوقات
وہ فنا کو بقا کا تحفۂ شوق
وہ عدم کو وجود کی سوغات
جس کے ہر لفظ سے عیاں اِک رمز
جس کی ہر بات میں نہاں اِک بات
مُو بہ مُو وہ صفات کا محرم
دو بدو وہ حریفِ جلوۂ ذات
دیکھتا کیا ہوں ! حوض کوثر پر
شاعروں کے وہ قبلۂ حاجات

غرقِ دریائے کیف ہیں بلکہ
غرقِ دریائے کیف و کیفیّات
فکر افروز جس کی صنعتِ فن
صانع فکر جس کی مصنوعات
وہ خود اپنے خیال کی مخلوق
خالقِ ذہن جس کی تخلیقات
وحی و الہام و آیہ و اِلقا
جس کے اعجازِ شعر میں اک بات
کشف و وجدان و خرقِ عادت و سحر
جس کے افسونِ فن کے نیرنجات
وہ تماشا جہاں تماشائی
مرزا نوشہ تو اہلِ ذوقِ برات
دل تھا مغلوبِ غالبِؔ مرحوم
میں نے بعد از ادائے تسلیمات
اسداللہ خان غالب سے
اِس طرح کی گزارشِ حالات

شوقِ بے تاب کھینچ لایا ہے
کعبۂ شوق و قبلۂ حاجات
کہیے باغِ بہشت میں کیا ہیں؟
آپ کے صبح و شام معمولات
کہیے کس طرح سے گزرتے ہیں
خلدِ رضواں میں آپ کے دن رات
موت کے بعد بھی ہے کرب فزا
بندِ غم اور رنجِ قیدِ حیات
کیا یہ سچ ہے کہ جان و دل کے لیے
موت ہے بندِ دوجہاں سے نجات
کوئی اجرِ کشاکشِ ہستی؟
کوئی شکلِ تلافیِ مافات
کیا یہی ہے حقیقتِ شبِ مرگ
صبحِ تازہ سے حاملہ اک رات؟
کیا یہی ہے وجودِ خوابِ عدم؟
ایک بیداریِ لطیف حیات؟

پیر و مرشد! مرید کہنہ سے
کچھ تو ارشاد بلکہ ارشادات
سُن کے مہمل سی گفتگو میری
ہنس دیے غالبِ ستودہ صفات
بادۂ سلسبیل و کوثر سے
مست و مخمور تھا وہ عارفِ ذات
مرزا نوشہ نے مجھ سے فرمایا
ہم نے سن لیں تمہاری معروضات
حال و ماضی میں کوئی فرق نہیں
مجملاً ہے یہ صُورتِ حالات
وہی ذوقِ دوام و خوفِ حدوث
پوچھتے کیا ہو میرے احساسات
وہی شامِ فراق و صبحِ وصال
یہی دِن رات تھے، یہی دن رات
وہی قیدِ حیات و بندشِ غم
وہی فکرِ مآل و ذکرِ نجات

اُفقِ زندگی پہ طاری ہے
اَبَدِیّت کی جاودانہ رات
کیا ہے یہ کائناتِ کُن فیکوُن
قطرۂ از محیطِ موجودات
کیا ہے یہ عالمِ وجود و بقا
ذرّۂ از جہانِ مخلُوقات
موت؟ اک ثانیے کی خاموشی
یا اچانک سکوُنِ اِدراکات
خَلوتِ قبر سے نکلتی ہے
اِس طرح بن سنور کے روحِ حیات
جس طرح بطنِ شب سے جلوۂ صبح
جس طرح بادلوں سے چاندنی رات
حُسن ہی حسُن ہے درونِ حجاب
نور ہی نور ہے پسِ ظلمات
لیکن اِس عالمِ عجیب میں بھی
طرفہ تر ہیں عجائباتِ حیات

ہم کو اب تک نہیں یہ علم کہ ہم
کون ہیں؟ کیا ہیں ؟ اور کیوں؟ ہیہات
کون، کیوں اور کیا ؟ یہ تینوں لفظ
جو سمجھ میں نہ آسکے وہ بات
نہ کوئی چیز بالقویٰ حادث
نہ کوئی شے قدیم تر بالذّات
مختصر یہ کہ ہم وہاں ہیں جہاں
نہ زمان و مکاں نہ سمت وجہات
نہ ظہورِ بدایت و آغاز
نہ حدودِ نہایت و غایات
روح کے بھی وہی مسائل ہیں
جسم کا جن سے واسطہ دن رات
کبھی اک منزلِ ہبوط و زوال
کبھی اک درجۂ عروج و ثبات
حرکت، مادّہ، توانائی
آفرینش، عدم، شہود، حیات

کچھ نہیں اِک جمالِ ذات پہ ہیں
صد حجاباتِ رنگ رنگِ صفات
اور یہ بھی تمام وہم وگمان
اور یہ بھی تمام مفروضات

رفیقِ راہ کوئی تیز گام ہو تو سہی
ظہورِ خضر علیہ السلام ہو تو سہی
غرورِ فرقۂ زہّاد ہے بجا لیکن
کوئی حریفِ حریفانِ جام ہو تو سہی
میں جی رہا ہوں علی الرغم زندگی ایدوست!
کسی کو حوصلۂ انتقام ہو تو سہی
بتاؤں فرقِ حلال وحرام زاہد کو
مگر ارادۂ بیت الحرام ہو تو سہی

# شاعرِ عہدِ نو

وہ شاعرِ دلنوازِ ہستی!
وہ محرمِ سوز و سازِ ہستی
وہ پردہ کشائے رازِ ہستی
وہ نازشِ ہست و نازِ ہستی
جو فکر و نظر پہ حکمراں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ جس کا پیامِ زندگانی
وہ جس کا مقام جاودانی
مغلوب ہے جس سے کامرانی
مسحور ہے جس سے نوجوانی
جو زندہ و باقی و جواں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

وہ جس کا مذاق، شاعرانہ
وہ جس کا مزاج، خسروانہ
وہ جس کی گزر، قلندرانہ
وہ جس کی نظر پیمبرانہ
جو رُوحِ حیاتِ جاوداں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے؟
وہ فاتحِ ممکناتِ تخلیق
وہ خالقِ کائناتِ تخلیق
صورت گرِ وارداتِ تخلیق
میزانِ صفات وذاتِ تخلیق
جو مطربِ غیب کی زباں ہے
وہ شاعرِ عہدِ نو کہاں ہے

# انکشافِ خاک

ہم نے جب انکشافِ خاک کیا؟
جگرِ ذرّہ چاک چاک کیا؟
جگرِ چاک چاکِ ذرّہ کو
کار فرمائے آب و خاک کیا
رازِ تخلیق فاش ہونے لگے
عقل و فن نے جو اشتراک کیا
ابدیّت کی راہ کو ہم نے
نورِ دانش سے تابناک کیا
سعیٔ پردہ درِیٔ فطرت میں
اِک ذرا بھی نہ خوف و باک کیا
شاہدِ کُن کو زندگی بخشی
ملک الموت کو ہلاک کیا

پردۂ علتِ حقائق کو!
اپنے ہاتھوں سے چاک کیا
روح کو مادّی بنا ڈالا
رُوح کو مادّے سے پاک کیا
فکر میں گتھیاں پڑیں جتنی
فکر میں اور انہماک کیا
ازلیّت سے مشترک ہو کر
ابدیت سے اشتراک کیا
خاکیوں کو فروغِ نو بخشا!
نوریوں کو جلا کے خاک کیا
کسی تدبیر میں جھجک نہ ہوئی
کسی تقدیر سے نہ باک کیا
پھول سے عطر رنگ و بو کھینچا
آبِ سادہ کو زہر ناک کیا
نور و ظلمت میں انفکاک نہ تھا
نور و ظلمت میں انفکاک کیا

خیرِ مطلق تھا شر سے آلودہ
خیرِ مطلق کو شر سے پاک کیا
شب کو کچھ اور تیرگی بخشی
دن کو کچھ اور تابناک کیا
دل کو کچھ اور حسرتیں بخشیں
غم کو کچھ اور دردناک کیا
ہر نشیب و فراز سے گزرے
سفرِ قلّہ و مُغاک کیا
پستیوں کو بلندیاں بخشیں
جو سما تھا اُسے سماک کیا
جاں کو جاناں سے منسلک کرکے
دل کا دلبر سے اِنسلاک کیا
ہم نے اے عقلِ سرمدی تجھ کو
مائل غور و انہماک کیا
ہم نے اے حُسنِ باطنی تجھ کو
اور پرُتاب و تابناک کیا

اپنے طرزِ تپاک سے آخر
خود بھی فطرت کو پُر تپاک کیا
خاک کو کیمیا بنا ڈالا
پھر بھی شکوہ کہ ہم نے خاک کیا
مختصر یہ کہ عقلِ انساں نے
ہر اک اقدامِ ہولناک کیا
عقل خود بھی سزا سے بچ نہ سکی
عشق نے عقل کو ہلاک کیا
عشق نے اپنی سوزناکی سے
دلِ آدم کو سوزناک کیا
کتنی آنکھوں سے چھین لیں نیندیں
کتنی عقلوں کو خواب ناک کیا

# قصدِ مریخ و ماہ

آؤ اپنے کو خضرِ راہ کریں
قصدِ مریخ و عزمِ ماہ کریں
پستیوں سے بلند تر ہو کر
آں سوئے مہر و مہ نگاہ کریں
بوالبشر تھے گناہ گارِ عروج
ہم بشر ہیں وہی گناہ کریں
جن کو جنّت میں چھوڑ آئے تھے
اُن سے تجدیدِ رسم و راہ کریں
جن کو قدوسیّت کا دعویٰ ہے
اُن کی فردِ عمل سیاہ کریں
جن کی معصومیّت مسلّم ہے
اُن کو مستی میں اِنتباہ کریں

محفلِ حُوریاں میں دَر آئیں
اور بے ساختہ گناہ کریں
خیمۂ نورؔ میں اُتر جائیں
پھر سے اپنے کو روسیاہ کریں
تا کجا تیرہ خاکداں میں قیام
سیرِ افلاک گاہ گاہ کریں
پیرِ گردوں کا حکم ہے کہ مرید
ترک ، آدابِ خانقاہ کریں
ہم ہیں سیّارہ گر ستارہ طراز
چاند تاروں کو فرشِ راہ کریں
عالمِ خاک ہے بہت محدود
نصب گردوں پہ بارگاہ کریں
ہم کہ ہیں رُوحِ عالمِ تخلیق
قلبِ کون و مکاں میں راہ کریں
کرّۂ ارض صرف اک دہلیز
آؤ اب سیرِ جلوہ گاہ کریں

مہر و مرّیخ و زہرہ و ناہید
تا کجا اِن سے ہم نباہ کریں
قیدِ افلاک سے گزر جائیں
اپنی ہستی کو بے پناہ کریں
ذکرِ خورشید و کہکشاں کب تک؟
تا کجا فکرِ برگِ کاہ کریں
چھین لیں تاجِ زرستاروں سے
سَرِ گردوں کو بے کلاہ کریں
ہم کہ خود صانعِ عجائب ہیں
مدحتِ صنعتِ الٰہ کریں؟
ایک حیرت کا کارخانہ ہے
جس کو دیکھیں جدھر نگاہ کریں
راز کھل جائیں نخلِ طوبیٰ کے
فاش اگر پردۂ گیاہ کریں
قلبِ ذرّہ میں گر خلش ہو زیست
صد ہزار آفتاب آہ کریں

قصدِ رفعت بجا مگر فی الحال!
کام پستی کے رُو براہ کریں
فتحِ ابوابِ مہر و ماہ سے قبل
ثبت ذرّوں پہ مُہرِ ماہ کریں
یوں سنواریں نگار خانۂ عرش
عرش والے بھی واہ واہ کریں
اک نئے عہد کی بنا ڈالیں
عالمِ کہنہ کو تباہ کریں!
آدمی ہے پناہِ ہر دو جہاں
آدمی کو جہاں پناہ کریں

ہم اُس تلاطمِ پنہاں میں غرق رہتے ہیں
جہاں زمان و مکاں ساتھ بہتے ہیں

# جوہری عہد

یہ کیا نظام ہے اے آسمانِ سفلہ شعار!
یہ کیا مذاق ہے اے روزگارِ ناہنجار!
زمیں ہے عرش نشینوں کے درپے تخریب
فلک ہے خاک نشینوں کے درپے آزار
ہزار عازمِ تسخیرِ مہر و مہ ہو کوئی
ہنوز غیر مسخر ہے خاکِ تیرہ و تار
وہاں مشاہدۂ غیب کا سوال ہی کیا؟
جہاں نظر سے نہاں جلوۂ پسِ دیوار
وہاں ہو کشفِ حقائق کا اِدّعا کس کو؟
جہاں حواس پہ ہو علم و معرفت کا مدار
یہ کائنات ہے کیا؟ اک بدیعۂ پُرہول
یہ کائنات ہے کیا؟ اک لطیفۂ قہّار

یہ کائنات ہے کیا؟ عرضِ جوہرِ تخلیق
یہ کائنات ہے کیا؟ اک وجودِ جوہر دار
حدودِ کون و مکاں تنگ تر نظر آئیں
اگر ہو نقشِ کفِ پا کی وسعتوں کا شمار
بہار اہلِ چمن کی نگاہ میں نہ بچے
خزاں جو فاش کرے برگِ خشک کے اسرار
فقط نفاستِ گل ہے نگاہِ گلچیں میں
فغاں! کہ آنکھ سے مستور ہے لطافتِ خار
رقیبِ وسعتِ صحرا ہے، ذرۂ پرتاب!
حریفِ عظمتِ قلزم ہے، قطرۂ ذخار!
اگر شجر کو جھنجھوڑیں برس پڑیں صحرا
اگر جگر کو نچوڑیں ٹپک پڑیں کہسار
یہاں چہ عمرِ بشر اور چہ عمرِ نوعِ بشر
بہت کہوں تو بس اک لمحۂ نمودِ شرار
یہاں چہ عقلِ بشر؟ اور چہ عقلِ نوعِ بشر؟
بہت کہوں تو بس اک لمحۂ سراب آثار

ہزار عالم و آدم ، ہزار خالق و خلق
ابھی ہیں عرصۂ تخلیق میں بہ شکلِ غبار
ہزار کون و مکان صد ہزار کون و مکاں
ابھی ہیں معرض خلقت میں واہمہ کردار
قضائے امر و ظہورِ مشیّت و تقدیر
فقط تواترِ کوُن و تسلسلِ اعصار

دل پیامِ شکیب دیتا ہے
کیسے کیسے فریب دیتا ہے

# عالمِ ناآفریدہ

فشارِ غم سے دل ہے یوں کبیدہ
کہ جیسے کشتیِ سیلاب دیدہ
مری ہستی بساطِ زندگی پر
فقط اک قطرۂ اشکِ چکیدہ
ہوا جاتا ہوں سوزِ غم سے تحلیل
کہ جیسے شبنمِ خورشید دیدہ
جہاں کتنے مسافر کھو گئے ہیں
چلا ہوں اُن منازل میں جریدہ
متاعِ دیدۂ و دل کی یہ توہین؟
جنوں بے دل، بصیرت کور دیدہ
گرہ دل کی ہے اب تک ناکشودہ
شرابِ جاں ہے اب تک ناکشیدہ

میں اک دل ہوں مگر اخلاص کُشتہ
میں اک گُل ہوں مگر گلچیں گزیدہ
خود اپنی جستجو میں کھو گیا ہوں
مثالِ طائرِ رنگِ پریدہ
خود اپنے آپ میں گم ہو گیا ہوں
بسانِ نکہتِ گل ہائے چیدہ
پسند آئے گا کیا۔ فکرِ جواں کو
یہ وقتِ سال خوردہ، سن رسیدہ
یہاں انساں ہے خود انساں سے بیزار
یہاں آدم ہے خود آدم گزیدہ
کسی میں زندگی باقی نہیں ہے
دل و دیدہ ہوں یا فکر و عقیدہ
کسی میں تازگی ملتی نہیں ہے
ذمائم ہوں کہ اخلاقِ حمیدہ
مگر ہاں! فطرتِ خلّاق میری
نہیں مایوسِ تخلیقِ جدیدہ

مرے ذہنِ رسا پر جلوہ گر ہے
نیا اک عالمِ نا آفریدہ
انوکھی ایک شام نوشگفتہ
نرالی ایک صبحِ نادمیدہ
یہ دنیا جس کی پیشانی پہ تحریر
حیاتِ نو کا نقشِ برگزیدہ
حیاتِ نو کی روحِ آفرینش
مساوات و اخوّت کا عقیدہ
وہ دنیا جس کے مردانِ خود آگاہ
مئے تخلیق کے لذّت چشیدہ
وہ اِنساں علم و عرفاں میں جو یکتا
وہ آدم آدمیّت میں جو چیدہ

# عہدِ نو کے سوال

ہم دمو! ہم نواؤ! ہم کارو!
اے مِرے عہد کے قلم کارو!
اے نئے قافلوں کے ہم سفرو!
اے نئی زندگی کے راہ برو!
نئی محفل کے بزم آراؤ!
نئی دُنیا کے کوہ پیماؤ!
تازہ گفتار و تازہ کار ہو تم
زندگی کی نئی بہار ہو تم
عہدِ نو کا ہراولی دستہ
تم ہر اِک راہ میں کمربستہ
آخرِ شب کی نرم سیر ہوا
تم سحر خیز طائروں کی نوا

وقت کا جلوۂ جہاں افروز
تم حیاتِ جدید کا نوروز
تم ہو پاکیزہ و شگفتہ و صاف
پہلی بارش کا قطرۂ شفاف
تم ہو فرداو دے کا آئینہ
صبحِ نو کی شعاعِ پیشینہ
زندگی کا دماغ وقت کا دِل
تم جبینِ عروسِ مستقبل
ثمرِ پیش رس برنگِ قبول
شاخِ عصرِ رواں کا پہلا پھول
ناز پروردگانِ لوح و قلم
تم سے تخلیق و ارتقا کا بھرم
اے کشائندگانِ پردۂ جاں
اے نمائندگانِ فکر جواں
جاں فزا خامشی کا گیت سہی
آج کچھ تم سے بات چیت سہی

تم نے سوچا برادرانِ عزیز!
شعر کیا شے ہے؟ زندگی کیا چیز؟
اصلِ اندیشۂ و سخن کیا ہے؟
اہلِ فن کس لیے ہیں؟ فن کیا ہے؟
ہم کہ ہیں آب و خاک و آتش و باد
کیوں ازل گیر؟ کیوں ابد بنیاد؟
ہم ہیں باوصفِ قیدِ سمت و جہت
کیوں ہے یہ لامکانیت کی صفت؟
ہم ہیں یہ ماورائے نقش و نگار
کیوں ہے اک حسنِ سرمدی کا نکھار؟
کس زمان و مکاں سے آئی ہے
زندگی خود کہاں سے آئی ہے؟
جسم و جاں ہیں یہ ہجر و وصل ہے کیا؟
خود زمان و مکاں کی اصل ہے کیا؟

مرکزِ نشو و ارتقا کیا ہے؟
ابنِ آدم کی انتہا کیا ہے
ہم کہ زندانیٔ سنین و شہور
ہم میں کیوں لانہایتی کا شعور
جب شمار نفَس ہے نفَسِ حیات
کیوں گمانِ حیات بعدِ ممات
ایک سے بڑھ کے ایک ہے یا ایک
مختلف ہے کہ اصلِ اشیاء ایک؟
اور پھر یہ لطیفہ ہائے جمال
خوبی و خیر و صدق و حُسن و کمال
دلبری کیوں ہے؟ دلربا کیا ہے؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
عاشقی کس بلا کو کہتے ہیں
حُسن کس کس ادا کو کہتے ہیں

کیا ہے آرامِ جان و لذتِ تن؟
نقشۂ قامت و نقوشِ بدن
خالِ مشکین و خدِّ نورانی!
شکنِ زلف و چینِ پیشانی!
کیوں یہ نظّارہ و نظر کا فسوں؟
لبِ گل رنگ و عارضِ گلگوں!
دست و داماں میں کیا تعلّق ہے؟
جان و جاناں میں کیا تعلّق ہے؟
کیا ہے سرمایۂ سکوت و سخن
لطفِ فن کاری و لطافتِ فن
عالمِ سرخوشی و خوش باشی
نغمۂ و شعر و رقص و نقّاشی!
کیوں یہ آخر انا کی خودنگری
ذوق تزئین و شوقِ جلوہ گری

حسن کے شعبدوں سے قطع نظر
کیا ہے خود سرگذشتِ نوعِ بشر
کیوں یہ انسانیت کا اوج و زوال
کیوں یہ تہذیب کا ہبوط و کمال
مختلف دور کے مختلف انساں
مصر و یونان و بابل و کنعاں
کبھی انجام اور کبھی آغاز
کیوں یہ تہذیب کا نشیب و فراز
کار فرما سماج میں اضداد
کیوں یہ آخر معاشرے میں فساد؟
کیا ہے قوموں کی اصلِ مرگ و حیات
کیوں ثقافت کے تہ بہ تہ طبقات
کیوں یہ تخلیقِ فکر و فن ہر آن
فلسفہ شعر، تجزیہ وِجدان

اے نئی زندگی کے معمارو!
اے نئی نسل کے قلم کارو!
تم کہ فکرِ جدید کے فرزند
عہدِ نو کے سوال ہیں یہی چند
آج موضوعِ فکر و فن ہیں یہی
یہی سرمایۂ سخن ہیں یہی
ہم دمو! ہم نواؤ! ہم کارو!
اے نئے عہد کے قلم کارو!

# سیاسی نظمیں

# جشنِ اسلامی

جشنِ اسلامی منالیں دھوم سے رندانِ قوم[1]
یہ سُرور و لطف وعیش و کامرانی پھر کہاں؟
اے غمِ خوں گشتہ! رنگِ شوق وحسرت تاکجا؟
اے دلِ خودکشتہ! کیفِ شادمانی پھر کہاں؟
زہد وتقویٰ کی قیودِ روز و شب ہیں تاک میں
یہ نشیلی صبحیں، یہ شامیں سُہانی پھر کہاں؟
ہے بہت نزدیک اے دل! ساعتِ ذکر و قیام
یہ ہوس یہ لغزشیں یہ شعر خوانی پھر کہاں؟
مدعیّانِ خلافت ہیں فقیہانِ دیار
ہم سے رندانِ وطن کی حکمرانی پھر کہاں؟
اے شریکِ بادہ! مُلاّ کی حکومت ہے قریب
چھک کے پی لے یہ شرابِ ارغوانی پھر کہاں؟

---

[1] قانون امتناع شراب کے نفاذ پر

اے رفیقِ حجرہ ! زاہد کا تسلّط ہے قریب
بابِ مے خانہ پہ یہ سجدہ فشانی پھر کہاں
عالمِ خشکِ تیمم میں کہاں تر دستیاں؟
آبِ کوثر تو بہت ہوگا یہ پانی پھر کہاں ؟
معرفت کا زعم ہوگا اور کچھ حق ناشناس
اِس خمارِ بے خودی کی سرگرانی پھر کہاں؟
قیدِ نامحرم بیں ہوں گی نازنینانِ حرم
دخترانِ شہر کی جلوہ فشانی پھر کہاں
مفتیانِ قوم کا فتویٰ کہ ہم ہیں اہلِ فکر
ہم سے بے فکروں کی فکرِ ترجمانی پھر کہاں؟
واعظانِ عہد کا دعویٰ کہ ہم ہیں اہلِ ذکر
ہم سے نافہموں کا ذکرِ بے زبانی پھر کہاں
خوش بیانانِ خرد کی خودستائی کا ہے دور
ہرزہ گویانِ جنوں کی بے زبانی پھر کہاں؟
محفلِ افکار میں یہ صبحِ پیری کا طلوع
اے تفکّر! منظرِ شامِ جوانی پھر کہاں

اے تصوّر! یہ تصوّر آفرینی تابکے!
اے تخیّل یہ تری عرش آشیانی پھر کہاں؟
اُشترانِ راہِ تقویٰ گامزن ہونے کو ہیں
یہ تری خرمستیاں اے یار جانی پھر کہاں
آج ہی تنقید کرلو صورتِ حالات پر
ناقدو! یہ امتحانِ نکتہ دانی پھر کہاں
آج ہی تحقیق کرلو حکمت و اسرار کی
عالمو! تحقیقِ اِسرار و معانی پھر کہاں؟
آج ہی تقریر کرلو مصحفِ رخسار پر
شاعرو! تفسیرِ جذباتِ جوانی پھر کہاں؟
آج ہی ہے فرصتِ عرضِ جنوں اے نوحہ خواں!
فرصتِ عرضِ جنوں اے نوحہ خوانی پھر کہاں
مہلتِ ہنگامۂ سوزِ نہاں ہے آج ہی!
مہلتِ ہنگامۂ سوزِ نہانی پھر کہاں؟
آج ہی میرے دلِ مرحوم سے ہولو وداع
مختصر یہ ہے رئیسؔ آنجہانی پھر کہاں؟

# رسمِ بندہ آزاری

شام سے آج دل پہ ہے طاری
نیم خوابی و نیم بیداری
صُورتِ آگہی و بے خبری
عالمِ بے خودی و ہشیاری
نہ کوئی نسخۂ سُبک روحی
نہ کوئی چارۂ گرانباری
نیم وا رہ دیدۂ خمار آلوُد
نیم بستہ رہ طلسمِ بیداری
جب ذرا بند ہوگئیں آنکھیں
کھُل گیا روزنِ خبر داری
گوشۂ تنگ و حجرۂ تاریک
اللہ اللہ تنگی و تاری!

رات کے کچھ عجیب سے تیور
صبحِ محشر کی جیسے تیاری
ہر طرف اک عجیب سا ماحول
وحشت و خوف و یاس و بیزاری
حبس و ہیبت کی اک مہیب فضا
کائناتِ حواس پر طاری
جس طرح کچھ خبیث روحوں کی
دہر میں ہر طرف عمل داری
چار سُو پر فشاں اندھیروں میں
بہ ہمہ ساحری و عیّاری
ایک آوارہ آتشیں مخلوق!
ایک نادیدہ فرقۂ ناری
کچھ تو خلوت سے جی بہت ہلکان
کچھ طبیعت پہ بوجھ سا بھاری
سوچتا تھا کہ اے خدائے کریم!
تا کجا رسمِ بندہ آزاری؟

کیوں اچانک جہاں میں اذنِ قیام
کیوں یکایک سفر کی تیاری؟
دلِ بیدار، قلب کا آزار
چشمِ بینا، نظر کی بیماری
کاہشِ فکر، فکرِ کاہشِ جاں
کاوشِ غم، جراحتِ کاری
جہل و ظلمت کی اَن گنت صدیاں
اُفقِ علم و عقل پر طاری
تا کُجا، کارگاہِ ہستی میں؟
یہ تضادات! ایزدِ باری!
چند افراد، برگزیدۂ خلق!
جن کے قبضے میں نعمتیں ساری
اور باقی تمام نوعِ بشر!
نذرِ جور و نشانۂ خواری
جنسِ ناکارہ جنسِ پُرمایہ
جیبِ خالی کی گرم بازاری

فکر و فن پر تسلطِ اوہام
علم پر جہل کی عمل داری؟
عزمِ تعمیر و شیوۂ تخریب
طرح اندازی و تبہ کاری
یا ابھی مُشتِ خاک کے احکام
کشورِ مہر و ماہ پر جاری
یا ابھی فاتحِ دو عالم پر
ایک ذرّے کا بوجھ بھی بھاری
آج بھی بدنصیب آدم زاد
صورتًا نُور۔ سیرتًا ناری
آج بھی نامراد نوعِ بشر
ہمہ آزادی و گرفتاری
جوہرِ عقل اوّلیں انساں
اور یہ جوہری تبہ کاری
حاصلِ علمِ آخریں "آدم"
اور یہ علم کی ستم گاری؟

اشرفِ خلق ارزلِ مخلوق!
ہائے یہ سادگی و پُرکاری
کس سے سیکھی ہے تیرے بندوں نے
اے خدا! خوئے دوست آزاری
آج بھی زندگی کا سرمایہ
جہل و افلاس و ذلت و خواری
آج بھی مشتِ خاک کی تقدیر
کس مپرسی و ہیچ مقداری
دورِ حاضر کے اہلِ دانش بھی
عہدِ ظلمت کے ترک و تاتاری!
جب ہماری سرشت تھی یارب!
غفلت و لغزش و گنہ گاری
ہم کو بخشی گئی امانتِ خاص
ہم کو سونپی گئی نگہ داری
اے خداوندِ قادر و جبّار!
کیوں یہ تقدیر؟ کیوں یہ جبّاری؟

# تماشا

عمل کے دوش پہ انسانیت کا لاشہ ہے
زباں پہ عدل کا نعرہ یہ کیا تماشا ہے
عمل کے ساز پہ آہنگِ کفر بے اِکراہ
زباں پہ اشہدُ ان لا الہ الا اللہ
عمل کے ہاتھ میں جہل و فساد کی تلوار
زباں پہ حرفِ نجات و حدیثِ استغفار
زباں دراز مگر پنجۂ عمل کوتاہ
تضادِ قول و عمل اسقدر! خدا کی پناہ!
عمل کی طرح زباں بھی فسوں سے آلودہ
قرار دادِ مقاصد[1] کے خوں سے آلودہ
یہ زہر خند ستم ہے نہ زہر خند کرو
یہ کھیل ہار چکے ہو یہ کھیل بند کرو

---

[1] پاکستان کی پہلی آئینی دستاویز۔

# مباحث و افکار

کسی زعیم قیادت کی خاص مجلس میں
چھڑے ہوئے تھے سیاسی مباحث و افکار
وہ رنگ رنگ مسائل بہ صورتِ تائید
وہ گونہ گونہ مباحث بہ صورتِ انکار
کہ رفتہ رفتہ چھڑی داستانِ کہنہ و نو
کہ ہے تتمّہ اقبال آخرش ادبار
وہی بزرگ تھے اب بھی مدارِ حرف و سخن
یہی غریب تھا اب بھی مخاطبِ سرکار
وہ گل فشاں تھے کہ ہم بھی کبھی تھے قائدِ ملک
میں تر زباں تھا کہ قائد طراز تھے سرکار
اُدھر یہ ناز کہ ہم تھے پناہِ قوم و وطن
اِدھر یہ عرض کہ ہاں! قبلہ گاہِ اہلِ دیار
اُدھر سوال کہ اپنی وزارتِ عظمیٰ!
اِدھر جواب کہ یکسر ملوکیت آثار

اُدھر یہ ظرف کہ ہر قول اپنا نقضِ صریح
اِدھر یہ حرف کہ حضرت پہ شرع و دیں کا مدار
وہ کہہ رہے تھے کہ اک پیرِ تسمہ پا کی طرح
وطن کے دوش پہ ہم تھے بجبر و قہر سوار
میں کہہ رہا تھا کہ حضرت تھے ظلِ سبحانی
مثالِ سایۂ بالِ ھُما ظفر آثار
وہ پوچھتے تھے کہ اقبال مابدولت کا
میں کہہ رہا تھا فلک قدر و آسماں مقدار
یہ گفتگو تھی کہ ناگاہ کوئی چلّایا
خموش فاعتبروا ایھا الاولی الابصار

خندۂ ناز کی قیمت ہیں ہمارے آنسو
دامنِ دوست کی زینت ہیں ہمارے آنسو
ہنسنے والو! تمہیں احساس نہیں ہے شاید
موجۂ بارشِ رحمت ہیں ہمارے آنسو

# انقلاب

ہم یہ کہتے تھے عوامی انقلاب آنے کو ہے
تم بصد اصرار کہتے تھے کہ آسکتا نہیں
آگیا
ہم یہ کہتے تھے کہ طوفانِ بلا چھانے کو ہے
تم کو انکارِ مسلسل تھا کہ چھا سکتا نہیں
چھا گیا
ہم یہ کہتے تھے کہ دنیائے کہن مٹ جائے گی
تم کو دعویٰ تھا کہ یہ دنیا تو مِٹ سکتی نہیں
مِٹ گئی
ہم یہ کہتے تھے کہ بازی غیر کی پٹ جائے گی
تم کو غرّہ تھا کہ یہ بازی تو پِٹ سکتی نہیں
پِٹ گئی

ہم یہ کہتے تھے کہ شانِ سلطنت کھو جائیگی
تم کو یہ ضد تھی کہ اپنی شان کھو سکتی نہیں
کھو گئی

ہم یہ کہتے تھے کہ دنیا منقلب ہو جائے گی
تم یہ کہتے تھے کہ ایسی بات ہو سکتی نہیں
ہو گئی

ہم یہ کہتے تھے کہ سورج قہر کا ڈھل جائے گا
تم یہ کہتے تھے کہ یہ سورج تو ڈھل سکتا نہیں
ڈھل گیا

ہم یہ کہتے تھے کہ جمہوری فسوں چل جائے گا
تم یہ کہتے تھے کہ یہ افسوں تو چل سکتا نہیں
چل گیا

ہم یہ کہتے تھے کہ پھر جائیں گے مزدوروں کے دن
تم یہ کہتے تھے کہ ناممکن ہے پھر سکتے نہیں
پھر گئے

ہم یہ کہتے تھے کہ شاہوں کے محل گر جائیں گے
تم یہ کہتے تھے قیامت تک تو گر سکتے نہیں
گر گئے

صبح دم کتنی کلیاں شگفتہ ہوئیں
شام تک پھول سارے بکھر جائیں گے
موت کوئی نیا حادثہ تو نہیں
تم بھی مر جاؤ گے ہم بھی مر جائیں گے

# عہدِ نو

اندھیری راتوں کی خامشی میں مجھے یہ آواز آرہی ہے
اٹھیں گے کب تک نہ سونے والے نئی سحر جگمگا رہی ہے
افق پہ چھایا تھا جو اندھیرا وہ رفتہ رفتہ سمٹ رہا ہے
فضا میں پھیلی تھی جو اداسی وہ دمبدم منہ چھپا رہی ہے
جہانِ کہنہ کو رونے والے! جہانِ کہنہ میں کیا دھرا ہے؟
وہ دیکھ سلمائے عصرِ تازہ نقاب رُخ سے اٹھا رہی ہے
وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آرہی ہے
فلاکتوں کے نشاں ہیں باقی ابھی تو کچھ امتحاں ہیں باقی
قدم نہ پیچھے ہٹے کہ قدرت ابھی ہمیں آزما رہی ہے
تباہیوں سے حزیں نہ ہونا ستم سے اندوہ گیں نہ ہونا
جسے سمجھتے ہیں آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے

# مشاہدات

تصوّر کو عرش آشیاں دیکھتا ہوں
تماشائے کون و مکاں دیکھتا ہوں
ترازوئے تقدیرِ اقوام لے کر
کم و کیفِ سود و زیاں دیکھتا ہوں
ہوا کی تہوں میں زمیں کی جڑوں میں
لہو زلزلوں کا رواں دیکھتا ہوں
مقدّر کی میزانِ نفع و ضرر میں
خسارے کا پلّہ گراں دیکھتا ہوں
چمن زارِ تہذیب حاضر کی تہ میں
بغاوت کے شعلے تپاں دیکھتا ہوں
شہنشاہیت کی رجز خوانیوں میں
تقاضائے آہ و فغاں دیکھتا ہوں

سیاست کی ہرزہ سرا محفلوں میں
تماشائے لفظ و بیاں دیکھتا ہوں
جوانانِ مشرق کو راہ طلب میں
مہ و مہر سے ہم عناں دیکھتا ہوں
سیہ[1] بَرِاعظم کے دیوار و در پر
پُر اسرار پرچھائیاں دیکھتا ہوں
پھر افریشیا کو جہادِ عمل میں
کمر بستۂ امتحاں دیکھتا ہوں
یہ ہے نصف شب اور اس نصف شب میں
طلوعِ سحر کا سماں دیکھتا ہوں
مراکش سے تا مصر و ایران و جاوا
نئی روحِ صاحب قراں دیکھتا ہوں
مضامین خونیں کی کس کو خبر ہے؟
فقط سرخیٔ داستاں دیکھتا ہوں

---

[1] سیہ براعظم یعنی افریقہ۔

# ہمارا دور آگیا

پرانے عہد توڑ دو کہ عہد اور آگیا
ہمارا دور آگیا
ہمارا دور آگیا ہمارے دور کو سلام
یہ عہدِ جہد و ارتقا یہ عصرِ تند و تیز گام
حیات کا پیام بر۔ حیات کا نیا پیام
بصد جلال و قاہری بصد شکوہ و احتشام
ہمارا دور آگیا
مقامِ احتساب میں نظامِ جور آگیا
ہمارا دور آگیا
پرانے عہد توڑ دو کہ عہد اور آگیا
ہمارا دور آگیا

گزر گیا زمانۂ خدیو و جم گزر گیا
ملوکیّت کا دوش پر لیے عَلم گزر گیا
جھکائے سر گزر گیا دبے قدم گزر گیا
اڑاؤ پرچمِ ظفر کہ عہدِ غم گزر گیا
ہمارا دور آگیا
جو دسترس سے دور تھا قریں وہ دور آگیا
پرانے عہد توڑ دو کہ عہد اور آگیا
ہمارا دور آگیا
اُبھر کے آب و خاک سے گزر کے برق و باد سے
نکل کے ہر جہنمِ ہلاکت و فساد سے
لہو میں ڈوب ڈوب کر یقین و اعتقاد سے
ہمارا دور آگیا وہ جیت کر جہاد سے
ہمارا دور آگیا
بدل کے کائنات کے قدیم طور آگیا
پرانے عہد توڑ دو کہ عہد اور آگیا
ہمارا دور آگیا

ظفر کا تاجِ زرفشاں جبیں پہ خم کئے ہوئے
مجاہدانہ شان سے سناں علم کئے ہوئے
عدوئے ہرزہ سنج کی زباں قلم کئے ہوئے
تہیّہ جہادِ نو قدم قدم کئے ہوئے
ہمارا دور آگیا
بجائے اُس نظام کے نظام اور آگیا
ہمارا دور آگیا

رگوں میں دوڑتا ہے خوں کہ جیسے بجلیوں کی رو
دلوں میں جوشِ عزم ہے کہ جیسے سیلِ تیز رو
شرارہ ریز و گل فشاں نشاط بخش و گرم رو
وہ آرہا ہے عہدِ نو وہ آرہا ہے عہدِ نو
ہمارا دور آگیا
جو زیرِ دستِ غیر تھا وہ زیرِ غور آگیا
ہمارا دور آگیا

چھان ڈالے قافلے والوں نے سب دشت و دمن
کچھ خبر یوسف کی ہے اے گرگِ آلودہ دہن
اے برادر! روزِ اوّل سے ہماری سرگذشت
وادیٔ کنعاں، ہوائے مصر، بوئے پیرہن!
پیر زن! منزل گہِ بردہ فروشاں ہے کہاں
اے زلیخا! کس طرف ہے تیرے یوسف کا وطن
چھپ گئے کس ابر میں گیارہ ستارے اور چاند
شام بے انجم ہماری اور شب بے انجمن
کلبۂ احزاں ہو یا زندانِ حُزن انجام کار
ماہِ کنعاں چاک دامن، پیرِ کنعاں بے کفن
ہم تو ہیں اک کشتۂ آلام تختہ ہو کہ تخت
ہم تو ہیں اک بندۂ بے دام بستی ہو کہ بن
آہ کرتا ہوں تو چہرے پر ہے برسوں کا غبار
سانس لیتا ہوں تو سینے میں ہے صدیوں کی گھٹن
اور کبھی احساس ہوتا ہے کہ پھٹ جائے گا دل
اور کبھی محسوس ہوتی ہے رگِ جاں میں چبھن
ہاں پرو رکھے ہیں میں نے رشتۂ انفاس میں
کشت زار سندھ و جہلم، وادیٔ گنگ و جمن

تم نے اے مطربانِ صبح بہار!
صبح کے گیت گا کے کیا پایا؟
تم نے اے دوستانِ مجلسِ شب
مجلسِ شب سجا کے کیا پایا؟
تم نے اے ساقیانِ بزمِ نشاط
مے عشرت پلا کے کیا پایا
اے جگر خستگانِ زہرِ حیات
تم نے یہ زہر کھا کے کیا پایا؟
تم نے اے عاشقانِ خانہ خراب!
اپنی دنیا لٹا کے کیا پایا
جو نہ اپنا سمجھ سکے تم کو
اُن کو اپنا بنا کے کیا پایا؟
بُول اے مرغِ خوش نوا تو نے
صبح دم چہچہا کے کیا پایا؟
بول اے قاصدِ صبا! تو نے
غنچہ و گل کھلا کے کیا پایا
تو نے اے شوقِ خانماں برباد!
اپنا سب کچھ گنوا کے کیا پایا؟

دوستو! اپنے آشیانوں پر!
تم نے بجلی گرا کے کیا پایا؟
ساتھیو! اپنے غنچہ زاروں میں
تم نے کانٹے اُگا کے کیا پایا؟
کھو گئے تم سے دور جا کر ہم!
تم نے نزدیک آ کے کیا پایا؟
تم نے ساحل پہ آ کے کیا کھویا!
ہم نے کشتی جلا کے کیا پایا؟
شمعِ رنگ و چراغِ لالہ نے!
اشکِ خونیں بہا کے کیا پایا؟
کس کا دستِ دعا قبول ہوا؟
آپ نے ہاتھ اٹھا کے کیا پایا
آج بھی ہر طرف اندھیرا ہے
جگنوؤ! جگمگا کے کیا پایا؟
کوئی نقاشِ مرگ سے پوچھے
نقشِ ہستی مٹا کے کیا پایا؟
اے ہوائے خزاں! بتا تو نے
شعلۂ گل! بجھا کے کیا پایا؟

کل رات دیکھے عبرت کے منظر
جاں ہائے بے تن، تن ہائے بے سر
کشور کشائی قلعہ بہ قلعہ
تیغ آزمائی لشکر بہ لشکر
مغلوں کے حملے ماضی کی جنگیں!
وہ آتشِ جنگ اور آبِ خنجر
مفتوح دونوں امروہہ اجمیر
لاہور و دہلی دونوں مسخّر
بحرِ ابد میں پہلو بہ پہلو
گنگا کی لہریں امواجِ کوثر!
جے رام جے رام جے رام جے رام
اللہ اکبر اللہ اکبر

○

کل خواب میرے کتنے منوّر
چاندوں کے مکھڑے چاندی کے پیکر
زلفیں گھٹائیں، آنکھیں ستارے
ہر شے درخشاں ہر شے معطّر

شامِ اودھ اور صُبحِ بنارس[1]
شامیں فسانہ، صبحیں فسوں گر
مستوں کے رقصے رندوں کے رَمنے
لاہور و دہلی، اجمیر و کلیر
وہ بارگاہیں، وہ خانقاہیں
کتنے ملنگ اور کتنے قلندر
جب نیند ٹوٹی، جب آنکھ کھولی
دیکھا کہ میں ہوں اور میرا بستر

○

یہ عجب طرح کی فسردگی مری زندگی کے چمن میں ہے
نہ وہ جوشِ طبعِ رسا میں ہے نہ وہ کیف فکرِ سخن میں ہے
نہ وہ حوصلے نہ وہ آرزو بس اب اے جنونِ بہانہ جُو!
دلِ غم زدہ کو نہ چھیڑ تو یہ غریب یادِ وطن میں ہے
عبث اے شعورِ خود آگہی! تجھے جستجو ہے رئیسؔ کی
کہ وہ محوِ عالمِ بے خودی نہ شمال میں نہ دکن میں ہے

---

[1] آزاد ہندوستان میں بنارس نام کا کوئی شہر نہیں اب اُسے وارنسی کہتے ہیں۔

کل رات کئی خوابِ پریشاں نظر آئے
جو شہر کہ آباد تھے ویراں نظر آئے
بکھری ہوئی روندی ہوئی قبروں سے گزر کر
ٹوٹے ہوئے مینارِ شہیداں نظر آئے
پہلے تو کسی قریۂ برباد میں ٹھہرے
آگے جو بڑھے گورِ غریباں نظر آئے
مہکی ہوئی اجداد کی خوشبو سے ہوائیں
ہر گام پہ آثارِ عزیزاں نظر آئے
جس گھر میں فرشتوں کی ضیا تھی اُسی گھر میں
ارواحِ خبیثہ کے چراغاں نظر آئے
جو مطلعِ تقدیسِ محبّت تھے وہ چہرے
خفگی کے سبب ہم سے گریزاں نظر آئے
ہم جن کو دغا دے کے کہیں بھاگ گئے تھے
وہ اہلِ حرم باسرِ عریاں نظر آئے
اک پیرِ مقدّس کا ہیولیٰ نظر آیا
پھر ریشِ سفید و دُرِ دنداں نظر آئے
ہم جن کی پریشانیِ خاطر کا سبب تھے
وہ عالمِ رُویا میں پریشاں نظر آئے

اک دامنِ عصمت کی کرن دور سے پھوٹی
دامن پہ کئی گوہرِ غلطاں نظر آئے
تھی جس کے تبسم میں ملائک کی حلاوت
صد حیف کہ وہ خواب میں گریاں نظر آئے
اُس شہر کو جس شخص کے مولد کا شرف ہو
وہ شخص اُسی شہر میں مہماں نظر آئے
لب پر رہے رئیس اپنے یہ مصرع کئی دن سے
کل رات کئی خوابِ پریشاں نظر آئے

شمیم گیسوئے مشکین یار لائی ہے
صبا اڑا کے پیامِ بہار لائی ہے
کسی عروسِ شبستانِ الف لیلہ کا
چرا کے اک نفسِ مشک بار لائی ہے
وطن کی یاد کسی بے دیار کی خاطر
وطن سے مژدۂ اہل دیار لائی ہے

# کوئل کوک

کوک ری کوئل کوک

بَدلی ہے. برسات نہیں ہے
ساون میں وہ بات نہیں ہے
رُوٹھ گئے ہیں اِندر راجا
برکھا رُت سے کہہ دو آجا

من میں سو گئی ہوک
کوک ری کوئل کوک

سُوکھ گئی اُمّید کی کھیتی!
سُوکھی کھیتی کیا پھل دیتی
ہریالی اُگتی ہے کہیں پر؟
بانجھ زمیں ہے بانجھ زمیں پر

بھوک اُگی ہے بھوک
کوک ری کوئل کوک

آج کا نقشہ اور نہ کل کا
وقت کا یہ پُر ہول دُھندلکا
ماضی کی زلفیں بے سُلجھی
حال کی گتھی اُلجھی اُلجھی
مستقبل مشکوک
کوک ری کوئل کوک

مشرق میں مغرب کے لُٹیرے
ڈاکے ماریں سانجھ سویرے
کیا کہیے دولت کے بھوکے
کیسی کیسی چالیں چوکے؟
کیسی کیسی چوک؟
کوک ری کوئل کوک

ایٹم بم کے خونیں بادل!
بستی بستی جنگل جنگل!
کوئی بھلا کس بات پہ پھُولے
کوئل جگنو رِم جِھم جھُولے
سب رسمیں متروک
کوک ری کوئل کوک

آج اپنی انتہائے نامرادی دیکھ کر
ہم کو اپنے دل کا عہدِ کامراں یاد آگیا
اضطرابِ ہجر پر قانع تھے اربابِ فراق
کیا قیامت ہے کہ وہ آرام جاں یاد آگیا
جب کسی نے پرسشِ غم کی بحسبِ اتفاق
مجھ کو اپنا اک عزیز مہرباں یاد آگیا!

# لوری

یہ رات ہے سخت تیرہ و تار
یہ رات ہے سخت کُوش و پُرکار
تو کس کے فراق میں ہے بیدار
اُوجھل ہیں نئی سحر کے آثار
سونا ہے سکوں کا راز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا
سوجا کہ نہ جاگ جائے فتنہ
اچّھا ہے یہ غم غلط ہو جلنا
سوچے گا جو شامِ غم میں اتنا
سونے کو بچے گا وقت کتنا؟
اے کشتۂ سوز و ساز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا

اللہ یہ شب کی سحرکاری؟
ہرچیز ہے صرف اعتباری
ہر دل پہ ہے بیدلی سی طاری
بوجھل ہے فضا تو رات بھاری
ماحول ہے کینہ ساز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا
گھنگور گھٹا گھنا اندھیرا
گیتی کو ہے ظلمتوں نے گھیرا
تیرا کوئی رازداں نہ میرا
یہ شب ہے؟ تو ہو چکا سویرا
یہ شب ہے شبِ دراز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا

دوہرے ہوں پرت کہ ہوں اکہرے
بادل ہیں فضا میں گھور گہرے
آنکھیں جو ہیں پٹ تو کان بہرے
ہر لب پہ ہیں مصلحت کے پہرے
اے طفلِ زباں دراز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا

یہ جوہری عہد، ایٹمی دَور
دورانِ ستم، زمانۂ جور
اک حشر سا رُوبرو ہے فی الفور
انساں سے توقعات کیا اور؟
انساں ہے ستم طراز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا

کس بات کا انتظار؟ کیسا ؟
یہ شکوۂ روزگار کیسا ؟
اے سوزشِ دل ! قرار کیسا؟
اغیار پر اعتبار کیسا ؟
احباب سے بے نیاز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا
بنجر میں عمل کے بیج بونا
ہے برگ و ثمر سے ہاتھ دھونا
بے کار یہ رات دن کا رونا
پیتل کو سمجھ رہا ہے سُونا
دنیا ہے فسُوں طراز سوجا
سوجا مرے دلنواز سوجا

با ایں ہمہ علم و عقل و جوہر
آدم کو نہیں سکوں میسّر
سائنس کے تجربے سراسر
تخریب و فساد و فتنہ و شر
ابوابِ بلا ہیں باز سوچا
سوچا مرے دلنواز سوچا
یہ گریۂ بے پناہ کب تک؟
ہنگامۂ اشک و آہ کب تک؟
قسمت کی طرف نگاہ کب تک؟
اللہ سے داد خواہ کب تک؟
اللہ ہے بے نیاز سوچا
سوچا مرے دلنواز سوچا

# یہ قیدِ وطن

اے دوست یہ پابندیِ آداب کہن کیا
ذکرِ وطن و قوم یہ خاکم بدہن کیا؟
اِس سکّۂ ناکارہ کا اب تک ہے چلن کیا
یہ دلّی و لاہور و بخارا و ختن کیا
یہ قیدِ وطن قیدِ وطن قیدِ وطن کیا
یہ قیدِ وطن کیا

آ تجھ کو بتاؤں کہ کہاں ہے وطن اپنا
ہر انجمنِ ہم نفساں ہے وطن اپنا
ہر لہجہ رواں اور دواں ہے وطن اپنا
اے قافلۂ نکہتِ گل! صحنِ چمن کیا؟
یہ قیدِ وطن قیدِ وطن قیدِ وطن کیا
یہ قیدِ وطن کیا

یہ قحط یہ آلام یہ جنگیں یہ بلائیں
ہیں نوعِ بشر کو وطنیّت کی سزائیں
موزوں ہیں ترے واسطے صحرا کی فضائیں
اے بادِ صبا! گُل کدۂ سرو و سمن کیا؟
یہ قیدِ وطن قیدِ وطن قیدِ وطن کیا
یہ قیدِ وطن کیا؟

پا بند بہرگام ہیں تہذیب کے فرزند
فطرت نہیں قیدِ وطن و قوم کی پابند
جغرافیہ و قومیّت و رشتہ وپیوند
ہر سمت یہ پابندیِ زنجیر و رسن کیا؟
یہ قیدِ وطن قیدِ وطن قیدِ وطن کیا
یہ قیدِ وطن کیا؟

# لہجۂ صدق

حق کا اظہار ہے ہر شاعرِ خود دار کا فرض
سچ کہو جرأتِ اظہار ہمیں ہے کہ تمہیں
لہجۂ صدق ہے رعنائیِ گفتار کا حسن
پاسِ رعنائیِ گفتار ہمیں ہے کہ تمہیں
سامراجی روشِ فکر کے پیغام برو!
ہوسِ فتنہ و پیکار ہمیں ہے کہ تمہیں

فن کہ فرہنگ صداقت ہے کسے کہتے ہیں
اور کیا چیز ہے فن کار تمہیں کیا معلوم
تم کو جمہوریت و عدل کے دعوے ہیں بہت
کیا ہیں جمہور کی اقدار تمہیں کیا معلوم
نعرۂ فتح تہِ تیغ کا مفہوم ہے کیا؟
رقصِ مستانۂ سرِ دار تمہیں کیا معلوم

# متفرق نظمیں

# نازِ نوبہار

وہ جانِ آرزو مرا مہماں ہے آج کل
مہماں ہی میزبانِ دل وجاں ہے آج کل
بادہ، بقدرِ رحمتِ یزداں ہے آج کل
انکارِ مے، جسارتِ عصیاں ہے آج کل
کیا روز و شب کا غم کہ غمِ روز و شب کا اجر
زلفِ سیاہ و عارضِ تاباں ہے آج کل
یعنی نفس نفس میں ہے سیلابِ رنگ و بو
یعنی نظر نظر میں چراغاں ہے آج کل
ہر روز روزِ عید، زہے التفاتِ دوست
ہر شب، شبِ برات کا ساماں ہے آج کل
اک نو بہارِ ناز کہ ہے نازِ نوبہار
میرے لیے شگفتہ و خنداں ہے آج کل
اُس کج ادا سے ربطِ نہاں ہے براہِ راست
اُس کم نظر کا لطفِ فراواں ہے آج کل
ہے اُن کے لب پہ مصرعِ تازہ رئیسؔ کا
وہ جانِ آرزو، مرا مہماں ہے آج کل

# نام

موسمِ گل کیا ہے؟ کانٹوں کے نکھر جانے کا نام
اور خزاں ہے پھول کے پتّے بکھر جانے کا نام
یوں تو کہنے کے لیئے زندہ ہے ہر اک ذی حیات
زندگی ہے جیتے جی کچھ کام کر جانے کا نام
سادہ لوحیِ عشق کی زود اعتباری کا لقب
اور نازِ حسن کچھ کہہ کر مکر جانے کا نام
فتح مندی ہے قمارِ عشق میں ہر اک شکست
جیت جانا ہے اسی بازی میں ہر جانے کا نام
باش اے مردِ زبوں ہمت کہ ہے مردانگی
دین اور دنیا سے مردانہ گذر جانے کا نام

سبوبکف ہے یہ کون آخر بہ نازو تمکینِ کافرانہ
نفس نفس میں شمیمِ صہبا نظر نظر میں شراب خانہ
گدائے مے خانہ پی رہا ہے خدائے مستی پلا رہا ہے
خمار ہے الہام جاودانی سرورِ وحیِ پیمبرانہ

# نگارِ صُبح

نہیں کہ شکوۂ دردِ جگر نہیں ہے مجھے
مجالِ عرضِ تمنّا مگر نہیں ہے مجھے
تغافلِ نگہِ دوست کی شکایت کیا
وہ بے خودی ہے کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے
درازدستیٔ گُل چین و باغباں کی قسم
غرورِ دستگہِ بال و پر نہیں ہے مجھے
نگارِ صبح ! مجھے خوابِ ہجر سے نہ جگا
کہ اعتبارِ نسیمِ سحر نہیں ہے مجھے

مرے اشعار ناقدری ہے جن کی نکتہ چینوں میں
اتر جاتے ہیں نشتر بن کے اہلِ دل کے سینوں میں
چلے آؤ کہ تم پر اشکِ آخر بھی فدا کردوں
فقط یہ ایک ہی موتی ہے آنکھوں کے خزینوں میں

# فطرتِ خلّاق

مگر ہاں فطرتِ خلّاق میری
نہیں مایوسِ تخلیقِ جدیدہ
مرے ذہنِ رسا پر جلوہ گر ہے
نیا اک عالمِ نا آفریدہ
انوکھی ایک شام نوشگفتہ
نرالی ایک صبحِ نادمیدہ
یہ دنیا جس کی پیشانی پہ تحریر
حیاتِ نو کا نقش برگزیدہ
حیاتِ نو کی روحِ آفرینش
مساوات و اخوت کا عقیدہ
وہ دنیا جس کے مردانِ خودآگاہ
ہے تخلیق کے لذت چشیدہ
وہ انساں علم و عرفاں میں جو یکتا
وہ آدم، آدمیّت میں جو چیدہ

# اندازِ بیاں اور!

سنتا ہوں کہ اردوئے معلّٰی کے سخنور
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
اور خود بھی ہے اُس مردِ قلندر کا یہ دعویٰ
حق نے مجھے بخشا ہے سخن اور زباں اور
غالب کا ہو انداز بیاں لاکھ نرالا
غالبؔ میں ہے اک ندرتِ پیدا و نہاں اور
وہ تازگیِ فکر، وہ ایجادِ معانی
یہ لطف کہ ہر لفظ میں معنی کا نشاں اور
غالب کو جو پڑھتے ہیں تو ہوتا ہے یہ محسوس
جس طرح کہ اردو ہے کوئی ایک زباں اور
ویرانۂ ابیات و خراباتِ غزل میں
اُس شخص نے تعمیر کیا اپنا جہاں اور
آزاد تھے از بسکہ قیودِ دو جہاں سے
حضرت نے بنائے ہیں زماں اور مکاں اور
غالب کا مکاں وسعتِ دنیائے تخیّل
زندانِ شب و روز میں غالب کا زماں اور

کہتا ہے کہ اشکالِ مطالب کے سبب سے
"رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور"[1]
کہتا ہے کہ گو بُتِ شکنی میں ہیں سُبک دست
"ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور"
"یارب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات"
لب پر ہے دَمِ بذلہ طرازی یہ بیاں اور
اور بذلہ طرازی میں ہے یہ عرض بھی شامل
"دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور"
کہتا ہے کہ تم شہر میں ہو پھر ہمیں کیا غم؟
"لے آئیں گے بازار سے جاکر دل وجاں اور"
لیکن یہ دل وجاں کی تجارت ہے فقط رَمز
بازار ہے غالب کا جدا اور دکاں اور
کس جوش سے کہتا ہے کہ دل کھول کے روتا
"ہوتے جو کئی دیدۂ خونبابہ فشاں اور"
سرتابہ قدم دیدۂ خونابہ فشاں تھا
خونابہ فشانی سے تھی رنگینیِ جاں اور
مرتا تھا اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
"جلاّد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور"

[1] واوین میں تمام مصرعے مرزا غالب کے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ فیضانِ حیاتِ ابدی سے
ہر لمحہ میسّر تھا اُسے جلوۂ جاں اور
کچھ اور بھی آشوبِ خزاں سے تھا شگفتہ
بڑھتے تھے سِن و سال تو ہوتا تھا جواں اور
کہتا ہے کہ لوگوں کو ہے خورشید کا دھوکا
"ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور"
غالب کے وہی داغ نہاں صورتِ خورشید
ہیں تازہ و روشن، گہر وجلوہ فشاں اور
ہر چند زباں اور بیاں ایک ہے سب کا
غالب کی زباں اور ہے غالب کا بیاں اور
سچ یہ ہے کہ ایسے قَدَر اندازِ سخن کا
"ہے تیر مقرر مگر اُس کی ہے کماں اور"
اور اُس کی کماں قوسِ کمانداِر ازل ہے
ہر ایک نشانے کے لیے جس کا نشاں اور
بیدؔل کے تخیّل کا ہے کچھ اور ہی عالم
غالبؔ کی ہے سرمستیِ افکارِ جواں اور
فیضیؔ و نظیریؔ کے مضامین ہیں بے مثل
غالبؔ کی ہے رعنائیِ طبعِ ہمہ داں اور

انکار نہیں صائبؔ و عُرفیؔ کے سخن سے
غالب کی نوا اور ہے غالب کی فغاں اور
الفاظ کے پردے میں معانی کی تہیں ہیں
ابلاغ نہاں اور ہے، اظہارِ عیاں اور
جانچا ہے بہ تحقیق ہر اک طرزِ ہنر کو
اِس طرز کا ملتا ہے ہنر پیشہ کہاں اور؟
شایانِ معانی ہے یہی اپنی نظر میں
ہونے دو جو ہے شیوۂ معنیِ نہاں اور
اِتمام اِسی شخص پہ ہے دیدہ دری کا
ہونے دو اگر ہے روشِ دیدہ وراں اور
دعوے تو بہت سے ہیں رئیس اہلِ سخن کو
ایسا تو نہ ہوگا ہمہ گیر و ہمہ داں اور
دُہرایئے آخر میں وہی مصرعِ استاد
"کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور"

# سوال یہ ہے کہ

شعور مُہر بلب ہے قلم بُریدہ زباں
سوال یہ ہے کہ اِس مرحلے پہ کیا لکھیے
رواجِ قتلِ سخن ہو تو مقتلِ فن میں
قلم کو آلۂ خونریزیِ قضا لکھیے
حیاتِ تازہ کی تہمت ہو جس سخن پہ اُسے
نوشتۂ اجل و دفترِ فنا لکھیے
حُدودِ فکر و نگارش جہاں ہوں تنگ وہاں
نہ شرح و بسط سے لکھیے نہ برملا لکھیے
بیانِ عظمتِ یزداں بجا سہی لیکن!
نہ اہرمن کو ضلالت کا دیوتا لکھیے
اگر ہو حضرتِ ہابیل کی ثنا منظور
تو پہلے حضرتِ قابیل کی ثنا لکھیے
رقم پذیر ہو گر قصّۂ مسیح و صلیب
تو پہلے سطوتِ روما کا ماجرا لکھیے

جو قتل نامۂ سقراط کی عبارت ہو
تو پہلے حکمتِ یونان کو مرحبا لکھیے
مصالحِ پسرِ سعد بھی رہیں ملحوظ!
جو داستانِ شہیدانِ کربلا لکھیے
ثنائے موجۂ صرصر کا بھی لحاظ رہے
اگر حکایتِ جاں بخشیِ صبا لکھیے
جہاں ہو مدحتِ خوبانِ روزگار وہیں
رقیبِ نحس کی تعریف جا بجا لکھیے
لکھیں جو خلد نشینوں کے نام نامۂ شوق
تو اشقیائے جہنم کو بھی دعا لکھیے
دروغ و صدق میں مشکل ہو امتیاز تو پھر
متاعِ کذب کو گنجینۂ صفا لکھیے
مگس کی مدح جو منظور ہو تو بے وسواس
مگس کو پیش رَوِ لشکرِ ہما لکھیے
کبھی قوی نظر آئے جو کوئی عبدِ ضعیف
تو اس کو صرف خداوند کیا خدا لکھیے
جو بے ضرر ہو تو پھر اژدہا بھی چیونٹی ہے
جو مصلحت ہو تو چیونٹی کو اژدہا لکھیے

مرے قلم پہ مُسلّط تھا صورتِ عفریت
یہی سوال کہ اِس مرحلے پہ کیا لکھیے؟
ملا جواب کہ لکھنا اگر ضروری ہو
تو اختصار سے لکھنے کا مدعا لکھیے
قلم جو دست قلم کار میں نہ ہو محفوظ
تو حرفِ صدقؔ بہ انگشت ہائے پا لکھیے

آؤ ہر ذرّے کے سینے میں بسا دیں کائنات
آؤ ہر قطرے میں سیلِ بے کراں پیدا کریں
ڈال کر سایہ بساطِ حرّیت کا خاک پر
تاجدارانِ بساطِ دوجہاں پیدا کریں

# طلوعِ بہار

لباسِ برف میں ملبوس وادی و کہسار
ہوائے عہدِ خزاں سے برہنہ تن اشجار
خمیدہ پشت چنار

زمیں فسردہ و یخ بستہ کھیتیاں ویران
اُفق پہ کُہر کا گھُمڑا ہوا غلیظ دھواں
خزاں تمام خزاں

اسیرِ جبر و تشدد ارادۂ آزاد!
سماج کا وہ تصادم معاشرے کا تضاد
فساد صرف فساد

کہ ناگہاں اُفقِ وقت سے بجاہ و وقار
طلوعِ صبح کے پیدا ہوئے حسیں آثار
خوشا طلوعِ بہار

# ہمیں تو ہیں

رعنائیِ چمن کے نگہباں ہمیں تو ہیں
اے عہدِ گل! بہارِ بہاراں ہمیں تو ہیں
کچھ ہے خجل تو گردشِ دوراں ہمیں سے ہے
اے دورِ چرخ! نازشِ دوراں، ہمیں تو ہیں
بخشا گیا تجھے سر و سامانِ آرزو
اے آرزو! وہ بے سر و ساماں ہمیں تو ہیں
ہم نے بدل دیا ہے نظامِ تصورات
اے فکرِ نو! مشیتِ یزداں ہمیں تو ہیں
جو شبنمِ فیوضِ ازل سے ہے بہرہ یاب
اے صبحِ نو وہ شاخِ دُرافشاں ہمیں تو ہیں
ہر کاروانِ جہد و طلب کو ہے جس پہ ناز
اے لیلیِ طلب! وہ حُدی خواں ہمیں تو ہیں

سچ ہے کہ مرگِ شوق ہے اک دردِ لا دوا
اے دردِ لا دوا ! ترا درماں، ہمیں تو ہیں
کیوں ہم سے درسِ شورش و مستی نہ لے یہ عہد
خوکردۂ مصائبِ دوراں ہمیں تو ہیں
اے عشق ! ہم سے ہے تب و تابِ حیاتِ عشق
جاناں ! حریفِ جلوۂ جاناں ہمیں تو ہیں
کیوں ہم پہ عہدِ گُل کو نہ ہو ناز اے رئیسؔ
شاہد ہے شاخِ گُل کہ غزل خواں ہمیں تو ہیں

زیست آلامِ جہانِ گذراں میں ہے محال
ہاں یہ کہیے کہ گذرتی ہے گذر ہوتی ہے
ان کی فرقت میں بھی رفتار زمانہ ہے وہی
شام آتی ہے، شب آتی ہے سحر ہوتی ہے
عشق اسے تھپکیاں دے دے کے سُلا دیتا ہے
زندگی خواب سے بیدار اگر ہوتی ہے

# تجارت

میں نے اک بار جوانی میں محبت کی تھی
اپنے ویرانے میں جنت کو بلا لایا تھا
گھر میں بازار کی زینت کو بلا لایا تھا
نوجوانی کی ضرورت کو بلا لایا تھا
راہ چلتی کسی عورت کو بلا لایا تھا
کثرتِ شوق سے تنگ آ کے یہ جرأت کی تھی
میں نے اک بار جوانی میں محبت کی تھی

عجب انداز سے آئی تھی مرے گھر لیلیٰ
ایک بوسیدہ سی شلوار دوپٹہ میلا
رُخ پہ زردی کی جھلک آنکھ میں کاجل پھیلا
حسن اور اس پہ یہ شوریدہ سری واویلا
حسن اور عشق نے مل جل کے تجارت کی تھی
میں نے اک بار جوانی میں محبت کی تھی

# جسارت

تم نے کیوں عہدِ محبّت کی جسارت کی تھی
اگر اس عہد کی تکمیل نہ کرسکتی تھیں
دل کے احکام کی تعمیل نہ کرسکتی تھیں
اپنے ماحول کو تبدیل نہ کرسکتی تھیں
تم نے کیوں جرأت پیمانِ محبّت کی تھی
تم نے کیوں عہدِ محبّت کی جسارت کی تھی

میں نہ کہتا تھا کہ حالات سے مجبور ہو تم
رسم و دستور روایات سے مجبور ہو تم
ہر اک اقدام، ہر اک بات سے مجبور ہو تم
ہائے کیا سوچ کے کم بخت یہ ہمت کی تھی
تم نے کیوں عہدِ محبت کی جسارت کی تھی

عہدِ الفت کا نتیجہ تمھیں معلوم نہ تھا؟
اس محبت کا نتیجہ تمھیں معلوم نہ تھا؟
کیا بغاوت کا نتیجہ تمھیں معلوم نہ تھا؟
کس بھروسے پہ مری جان بغاوت کی تھی؟
تم نے کیوں عہدِ محبت کی جسارت کی تھی

آج روتی ہو کہ رونے کی اجازت بھی نہیں
آج نالاں ہو کہ فریاد کی رخصت بھی نہیں
اب یہ شکوہ کہ یہاں اذنِ شکایت بھی نہیں
تم نے پہلے بھی کسی سے یہ شکایت کی تھی
تم نے کیوں عہدِ محبت کی جسارت کی تھی

اب یہ کہتی ہو کہ میں پیار نہیں کرسکتی
جذبۂ شوق کا اظہار نہیں کرسکتی
کوئی وعدہ، کوئی اقرار نہیں کرسکتی
پہلے کیوں وعدہ واقرار کی زحمت کی تھی
تم نے کیوں عہدِ محبّت کی جسارت کی تھی
اب یہ کہتی ہو کہ قسمت کی خبر تھی نہ مجھے
اپنی کم زوریِ فطرت کی خبر تھی نہ مجھے
کچھ بھی انجامِ محبت کی خبر تھی نہ مجھے
مجھ پہ آغاز میں کیوں اتنی عنایت کی تھی
تم نے کیوں عہدِ محبت کی جسارت کی تھی

# صبحِ کہسار

جھلملاتی ہے افق پر یوں شعاعِ صبحِ نور
قُبّۂ جنّت پہ جیسے جلوۂ رخسارِ حُور
اللہ اللہ ختمِ شب پر روزِ روشن کا ظہور
جاگتے ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں طیور

صبح آئی گود بھرنے دامنِ کہسار میں
اُف وہ گوہر ریز جھرنے دامنِ کہسار میں

یہ حسیں منظر یہ دلکش کوہساروں کا جمال
حُسنِ فطرت کے حقیقی رازداروں کا جمال
وہ فضائیں نرم و نازک ابر پاروں کا جمال
وہ زمیں پر مسکراتے سبزہ زاروں کا جمال

صبحِ تازہ کا ظہور انوار کی محراب سے
جَل پری جیسے ابھر آئے کوئی گرداب سے

سر اٹھائے چوٹیاں کہسار کی وہ آس پاس
برف کا پہنے ہوئے شفاف و پاکیزہ لباس
آبشارِ کوہ میں یوں صُبحِ نو کا انعکاس
آرسی جس طرح دیکھے کوئی دلہن بے ہراس

صبح کے جلووں سے ہر ذرہ درخشاں ہو گیا
برف کے آئینہ خانے میں چراغاں ہو گیا

اللہ اللہ یہ نسیمِ کوہ کی سرشاریاں
چل رہی ہیں بادۂ سرمست کی پچکاریاں
جھومتی ہیں اِس ادا سے قدرتی پھلواریاں
جس طرح ناچیں دلہن کی انجمن میں کنواریاں

کتھکوں کا ناچ جیسے رَتجگے کی رات میں
جس طرح میراثنیں ٹھمکیں کسی بارات میں

صبح اور پھر صبح کیسی؟ دامنِ کہسار کی
میٹھی میٹھی سی پھواریں بارشِ انوار کی
جگمگائے برف پاروں میں چمک تلوار کی
نرم رو جھونکوں میں تیزی خنجروں کی دھار کی
اِس فضا میں صبح کی یوں جلوہ فرمائی ہے آج
عید کی محفل میں جیسے شب برات آئی ہے آج

شوخ ندیاں بہ رہی ہیں، بھیرویں گاتی ہوئی
دیس کی دُھن میں بدیسی گیت دھراتی ہوئی
بن کی چڑیاں چہچہاتی، پنکھ پھیلاتی ہوئی
اڑ رہی ہیں آسمانوں کی خبر لاتی ہوئی
گھونسلوں میں دل شکستہ تھیں شبِ دیجور سے
دھوپ میں آکر نہا جاتی ہیں موجِ نور سے

وہ گھنے پیڑوں کی صف بندی کنارِ آبجو
جھاڑیاں وہ اَن گنت رنگ و روش کی چار سو
فطرتِ فیاض کا اللہ رے اِسراف نمو
ایک اک لمحے میں لا تعداد صَرفِ رنگ و بُو

قامتوں کے عارضوں کے اور گیسوؤں کے ڈھیر
کتنے رنگوں کے ذخیرے کتنی خوشبوؤں کے ڈھیر

بڑھ گیا ہے صبح کے پرتو سے ہر ذرّے کا مول
کوہساروں پر چڑھایا دھوپ نے چاندی کا خول
کھول اے چشم تماشا! دامنِ نظارہ کھول
رول یہ شبنم کے موتی دامنِ سبزہ سے رول

کاشفِ قدرت، جمالِ جلوہ آرا صبح کا
رویتِ باری ہے انساں کو نظارا صبح کا

# کوچۂ محبوب

ابھی تک ان در و دیوار سے مجھ کو محبت ہے
یہ پتھر ہیں مرے عہدِ جنوں کی یادگار اب تک
یہ روزن ہیں کشادہ صورتِ قلبِ فگار اب تک
یہ محرابیں ہیں عکسِ حلقۂ گیسوئے یار اب تک
یہ دالان! آہ یادوں کے لیے آغوشِ الفت ہے
ابھی تک ان در و دیوار سے مجھ کو محبت ہے

یہی وہ خم شدہ دیوار ہے جس کے دریچے سے
کسی نے ناز سے پہلی پہل شرما کے جھانکا تھا
مجھے وارفتۂ ذوقِ تماشا پا کے جھانکا تھا
دبے پاؤں دریچے کے قریب آ کے جھانکا تھا
نظر میں آج بھی رقصاں وہی معصوم صورت ہے
ابھی تک ان در و دیوار سے مجھ کو محبت ہے

یہ دیواریں وہی ہیں کوئلے سے جن پہ چھپ چھپ کر
لکھا کرتا تھا اُن کا نام اپنے نام سے پہلے
یہی پیغام جاتے تھے ہر اک پیغام سے پہلے
یہی دیوار، میری حسرتِ ناکام سے پہلے
فصیلِ فتح تھی اور آج اک دیوارِ حسرت ہے
ابھی تک ان در و دیوار سے مجھ کو محبّت ہے

خدا جانے اب اس گھر کے مکیں کس حال میں ہوں گے
بہا کر لے گئیں تقدیر کی لہریں کہاں ان کو؟
کہاں لے جاکے پٹکا تو نے دورِ آسماں ان کو!
کیا اے زندگی! کس سرزمیں پر رائیگاں ان کو!
اب اُن کا نوحہ خواں اک زائرِ شہرِ محبّت ہے
ابھی تک اِن در و دیوار سے مجھ کو محبّت ہے

یہ در، یہ سہ دری، یہ صحن چی، یہ حُجرے
یہ دل تھا اِس حویلی کی فضا کا راز داں برسوں
بہائے ہیں جنونِ شوق نے آنسو یہاں برسوں
رہا ہے میری فردوس تمنّا، یہ مکاں برسوں
وہی گھر ہُو کا عالم ہوگیا، کیا جانئے عبرت ہے
ابھی تک اِن در و دیوار سے مجھ کو محبّت ہے

سلام اے کوچۂ محبوب، اے ویرانۂ ماضی!
طوافِ شمع کشتہ کے لیے پروانہ آیا ہے
سُن اے تاریخِ ماضی! تجھ تک اک افسانہ آیا ہے
مبارک تجھ کو ویرانے، ترا دیوانہ آیا ہے
وہ دیوانہ کہ جو آوارۂ صحرائے غربت ہے
ابھی تک ان در و[1] دیوار سے مجھ کو محبّت ہے

---

[1] یہ مکان ۱۹۴۷ء کے بعد کھنڈر بن گیا۔

# طلسماتِ فرنگ

موت سے گر بھاگ سکتا ہے تو بھاگ، اے مستِ خواب!
زلزلوں کی کشمکش ہے اور یہ دنیائے خراب
لکھ چکے ہیں کاتبانِ نامۂ قہر و عذاب
عصرِ حاضر کے مقدر میں سزائے پیچ و تاب
یا گرفتِ روزِ محشر یا فشارِ انقلاب
گو بظاہر میں فسردہ ہے جہانِ آب و گل
ذرّے ذرّے کے قوائے زندگی ہیں مضمحل
کون واقف ہے کہ اِس خرمن کدے کے متصل
انقلابِ تازہ کے آتش کدے ہیں مشتعل
دیکھتی ہے فطرتِ خوابیدہ بیداری کے خواب

یہ جہانِ کُہنہ یہ ویرانۂ عہدِ قدیم
پھر دِکھانا چاہتا ہے منظرِ ذبحِ عظیم
کام لے ہمّت سے او سرگشتۂ اُمید وبیم
خون کے دھاروں میں مضمر ہے صراطِ مستقیم
نوکِ خنجر سے کھلیں گے فتح و فیروزی کے باب

سَر بہ کَف ہے روحِ آزادی بپاسِ نام و ننگ
سرخیِ خونِ شہیداں سے فضا ہے لالہ رنگ
ٹوٹتا ہے دیکھیے کب تک طلسماتِ فرنگ
بال و پر کھولے ہوئے تیار ہے عفریتِ جنگ
ہے صف آرا سامراجی طاقتوں سے انقلاب[1]

---

[1] یہ نظم دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء) سے ذرا قبل لکھی گئی تھی۔

# جاگ!

بیداری کامل سے ہے اک حشر بپا، جاگ!
بیدار ہوا قافلۂ اہلِ وفا، جاگ!
رہ رہ کے چلی آتی ہے آوازِ درا، جاگ!
جاگ اے خضرِ وادیٔ تسلیم و رضا، جاگ!
اے مردِ خدا! مردِ خدا! مردِ خدا جاگ!

زیبا نہیں غازی کو خمارِ شبِ مستی!
یہ بے خودی و خستگی و بادہ پرستی!
اُف کتنا دل آویز ہے ہنگامۂ ہستی
یا خوابِ عدم میں ہمہ تن غرق ہو یا جاگ
اے مردِ خدا! مردِ خدا! مرد خدا جاگ!

یہ بلبلِ بیدار کی فریادِ جنوں ریز
پیغامِ سحر خیز ہے، پیغامِ سحر خیز
مشرق میں ہیں آثار سحر کتنے دل آویز؟
ہے جلوہ نما سرخیِ خونِ شہدا، جاگ!
اے مردِ خدا! مردِ خدا! مردِ خدا جاگ!

تو زادۂ طوفاں ہے نہ پروردۂ ساحل
تو منزل و مقصد ہے نہ آوارۂ منزل
خوابیدہ ترے عزم میں بیداریِ کامل
اے بندۂ حُر! عزم کو دے اذنِ وغا، جاگ!
اے مردِ خدا! مردِ خدا! مردِ خدا جاگ![1]

---

[1] اس نظم کا تعلق تحریکِ پاکستان سے ہے۔

# تم اور ہم

تم، حریر و اطلس و ریشم مبارک ہو تمھیں
ہم، ہمارے جسم پر ہیں چند بوسیدہ لباس
تم، گل و گلدستہ و شبنم مبارک ہو تمھیں
ہم، ہمارے کاغذی پھولوں میں کوئی بُو نہ باس
تم، مبارک ہوں تمھیں قصرِ طرب کے بام و در
پڑ رہیں گے ہم کسی دیوار کے سائے تلے
تم، مبارک ہو تمھیں محرابِ ایوانِ جمال
اور ہم مر جائیں گے تلوار کے سائے تلے
تم، کہ عرش و فرش کو سمجھے ہوئے ہو اپنی مِلک
ہم، کہ اپنے ہاتھ سے ہر ملکیت کو کھو دیا
تھی وہ آزادی تمھارے واسطے جنّت بدوش
جس نے اپنے واسطے تخمِ مصائب بو دیا
تم، کہ صوفی بن کے صوفوں پر مزے کرتے ہو تم
ہم، کہ بستر سنگ ریزوں کا ہمارے واسطے
تیرِ بارانِ حوادث سے تمھیں کیا واسطہ
سامنا آفت کے نیزوں کا ہمارے واسطے

کیا ہزاروں گھر لٹے تھے انقلابی عہد میں
صرف اِک ایوانِ سلطانی سجانے کے لیے؟
بلبلوں کے خون سے سینچا گیا تھا یہ چمن
چند غنچے، چند شاخوں پر کھلانے کے لیے؟
لُٹ گئی تھی چند پھولوں کے لیے ساری بہار
بجھ گئے تھے چند شمعوں کے لیے سارے چراغ!
مِٹ گئی تھیں چند بوندوں کے لیے امواجِ بحر
خونِ تاکستان کا حاصل بس اِک دَورِ ایاغ!
ایک سائے کی طلب میں بھاگتی تھیں منزلیں
چند قطروں کی ہوس میں دوڑتے تھے آبشار
چند نعروں کے لیے سرگشتہ تھے اہلِ وطن
چند لمحوں کے لیے بدلا تھا نظمِ روزگار
ہم سے تم غافل نہ ہو اے رہ نمایانِ عوام!
اب بھی لاکھوں سر پھرے انساں ہمارے ساتھ ہیں
تم ہمارے ہاتھ نفرت سے جھٹک سکتے نہیں
جو تمھارے حق میں اٹھے تھے یہی وہ ہاتھ ہیں

# الہامِ سروش

دل تھا کل سخت تلاطم میں کہ الہام صفت
آئی کانوں میں یہ آوازِ سروشِ فطرت
کہ نہ ہو فتنۂ ایام سے اتنا دل گیر
شیوۂ کفر ہے انکارِ نزولِ رحمت
تو نے سوچا کہ بہر گام ہے کیوں دام بلا
باوجودیکہ اب آزاد ہے تیری ملّت
تو سمجھتا تھا فرنگی کا سیاسی غلبہ
کوئی لعنت ہے تو یہ سب سے بڑی ہے لعنت
لیکن اے کم نظر و کج عمل و کج اندیش!
تو رہا بے خبرِ اصلِ اصولِ قدرت
صرف آزادیِ تشکیلِ حکومت ہی نہیں
ضامنِ ضبطِ وطن ناظمِ نظمِ ملّت
کشورِ پاک کی تشکیل تھی اک خوابِ جمیل
لیکن اِس خواب کی تعبیر؟ تو خوابِ غفلت
سخت حیرت ہے کہ آزاد وطن کے باوصف
ہوسکی تجھ سے نہ تکمیلِ امورِ ملّت

ہے وہی ملک مگر ولولۂ خدمت ملک!
ہے وہی قوم مگر متحدہ قومیت!
تھا تری جہدِ مسلسل کا صلہ پاکستان
کس کو ملتا ہے یہ انعام ارے دوں ہمت!
اور ہی کچھ ہیں زمانے میں ترقی کے اصول
صرف آزادیِ ظاہر ہی نہیں اصل صفت
کہیں فرقے، تو کہیں صوبہ پرستی کی وبا
بدگمانی کے مرض بدعملی کی علت
اپنے دیرینہ مقاصد کو فراموش نہ کر
کہ انھیں سے ہے فقط نظم و نظامِ ملت
ہے اُسی قوم کے شایاں شرفِ آزادی
موجزن جس میں ہو روحِ عمل و حریت
مطمئن ہو نہ فقط زینۂ آزادی سے
ہے یہ اک مرحلۂ بامِ بلند و رفعت
تجھ کو آزادِ تفکر کے بہت دعوے ہیں
وقت دیتا ہے تجھے جہد و عمل کی دعوت

# اک ننّھی سی قبر پر

اے گوشۂ تربت! یہ تو بتا، کل ہم جو امانت لائے تھے
مٹّی میں ملانے کی خاطر، اک پھول سی میّت لائے تھے
ہم نے جو اندھیرے کو تیرے ننّھا سا ستارا سونپا تھا
اے خاکِ لحد! کل ہم نے تجھے جو راج دلارا سونپا تھا
کیا اب بھی ترے دامن کے تلے، وہ نازوں کا پالا سوتا ہے؟
کیا اب بھی اندھیری راتوں میں، وہ گھر کا اُجالا سوتا ہے؟
اُس ڈوبے ہوئے تارے میں کوئی مدھم سی چمک اب باقی ہے؟
اے گوشۂ تربت! کچھ تو بتا، اُس گل میں مہک اب باقی ہے؟
کیا آج بھی دُھندلی صبحوں میں، مرقد کی زمیں تھرّاتی ہے؟
کیا اب بھی کسی کے رونے کی آواز کہیں سے آتی ہے؟
دیکھا ہے یہاں گریاں تو نے! کیا اب بھی کسی دُکھیاری کو؟
رہتی ہے تلاش اک تربت کی، کیا اب بھی کسی بے چاری کو؟

اِس خاک کو چہرے سے مَل کر اشکوں سے کوئی منہ دھوتا ہے؟
کیا کوئی شکستہ دل بوڑھا، اِس ڈھیر پہ آکر روتا ہے!
کیا اب بھی نسیمِ صبح کبھی، اِس خاک پہ پنکھا جھلتی ہے؟
دم بھر کو چمکتے جگنو کی، کیا شمع یہاں پر جلتی ہے؟
اِس راہ کے چلنے والے کیا جاتے ہیں یہاں سے کترا کر؟
یا کوئی مُسافر رُکتا ہے ننّھی سی لحد کے پاس آکر؟
ہوتا ہے عزیزوں کا جھرمٹ کیا اب بھی گُل افشانی کے لیے؟
کیا سانجھ سویرے اب بھی کوئی آتا ہے دعا خوانی کے لیے؟
اے خاکِ لحد! ذرّوں میں ترے اک نقش نمایاں ہے اُس کا؟
اللہ نگہباں ہے تیرا، اللہ نگہباں ہے اُس کا
پہلو میں ترے تنہائی سے وہ راحتِ جاں بے تاب نہ ہو
جو رُوٹھ گئے ہم سے سویا ہے، اے خاکِ لحد! بے خواب نہ ہو

# دوراہہ

بزمِ حاضر میں ملی تقدیرِ پروانہ مجھے
خود جلا جاتا ہوں اوروں کو جلا سکتا نہیں
شاخِ ویراں کا مغنّی عہدِ سرما کا پرند
موسمِ گُل کے رسیلے گیت گا سکتا نہیں
جلوۂ بے رنگ قیدِ آئنہ سے ہے بُلند
جوہرِ زنگار خود کو جگمگا سکتا نہیں
العطش گویانِ صحرائے تمنّا ! الفراق
خشک چشمہ ہوں کسی کے کام آ سکتا نہیں
عہدِ حاضر اِک دوراہہ ہے امید و بیم کا
قافلہ کس سمت مڑ جائے بتا سکتا نہیں

# شامِ خزاں

گُم ہے تنہائیوں میں شامِ خزاں
وہ مشینیں اُگل رہی ہیں دھواں
کوئی سرما زدہ پرندۂ صبح
آشیاں کی تلاش میں پرّاں!
ایک طیّارۂ خلا پرواز!
اُفقِ بے نشاں کی سمت رواں
کتنی تاریک ہے زمیں کی جبیں
کتنا دھندلا ہے آسماں کا سماں

# کم سے کم

چھین لیں خود جو ہر اشیاء جو ہوں برہم سے ہم
پھول سے خوشبو، چمن سے رنگ و بو، شبنم سے نم
ہم سا مردِ شیر دل اور گرگِ فتنہ سے گریز؟
خود جو ضیغم ہو اُسے کیا حملۂ ضیغم سے غم
لیکن اِس کے باوجود ایدوست! راہِ شوق میں
ہم نہایت کم نصیب و کم طلب ہیں کم سے کم
گو خم و پیچ حوادث سے نہیں آشفتہ حال
ہیں بہت آشفتہ ان کے گیسوئے برہم سے ہم
ابتدا یہ تھی کہ ذوق ہم دلی تھا اور دل!
انتہا یہ ہے کہ گھٹتا ہے دمِ ہمدم سے دَم
اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہوگی بھلا!
خرّمی کرنے لگی ہے اس دلِ خرّم سے رَم
خارِ حسرت کیا گل عیش و طرب بخشے ہمیں
شہد سے شکر ٹپکتی ہے یہاں اور سَم سے سَم

عاشقی سے زندگی کی لذتوں کی آرزو !
جس طرح مانگے کوئی اک چشمۂ بے نم سے نم
ہم بھی اہل دل میں ہیں دل کی بدولت روشناس
جس طرح آفاق میں مشہور جامِ جم سے جم
واہ ! ہم دونوں کی ازخود رفتگی بھی خوب ہے
آپ سے ہیں آپ بیگانہ، خفا ہیں ہم سے ہم
دستِ انساں میں ہے حُسن دوجہاں کا آئنہ
شاہدِ فطرت نکال اب گیسوئے پُرخم سے خم
کس کو ہے آدم کی اولاد مکرّم سے گریز !
کون کرتا ہے بشر کے رتبۂ اکرم سے رَم!
نغمۂ ایثار یوں مخفی ہے اپنی روح میں!
ساز میں جس طرح وابستہ ہے زیر و بم سے بم
حُسن کا محرم ہے عشق، ایسے کہ جیسے منسلک
رنج سے رنج، آرزو سے آرزو اور غم سے غم

# یہ میرا وطن ہے

بہت ہو چکی مدحتِ مصر و ایراں
سُن اے تذکرہ گوئے تاریخِ انساں
یہ میرا وطن ہے کہ جس کے مقابل
نہ آشور و بابل نہ روما و یوناں
یہیں صُبح پہلی پہل مسکرائی
وہ نظمِ تمدّن کی صُبحِ درخشاں
یہیں شام پہلی پہل جگمگائی
وہ بزمِ تفکّر کی شامِ فروزاں
یہی مہبطِ آدمِ بوالبشر ہے
کہیں بھی سہی مولدِ نوعِ انساں
گلوں کا وطن گل عذاروں کا مسکن
گلستانِ جان و گلستانِ جاناں
یہیں آریوں نے وہ دنیا بسائی
کہ ہیں جس کے آثار اب تک نمایاں

یہیں علم و فن نے وہ فن کاریاں کیں
کہ خود فن کو حاصل ہوا اپنا عرفاں
یہیں جسم نے وہ ہیولے تراشے
کہ دنیائے محسوس ہے جن پہ نازاں
یہیں روح نے وہ تجلّی دکھائی
کہ روحِ تجلّی ہے خود جس سے حیراں
یہیں آسمانوں سے اَوتار اترے
یہیں دیوتاؤں پہ اِترائے اِنساں
بظاہر اِسی خاک کے چند خاکے
مجاز اور حقیقت بھگت اور بھگواں
بباطن اِسی بزم کے چند جلوے
حدوث و قدم اور ہیدا و پنہاں
تصوّف کا پہلا وطن اللہ اللہ!
یہی خطّہ پاکِ روشن ضمیراں
اِسی خاک پر دیو بھی دیوتا بھی
یہیں تحتِ اِنساں یہیں فوقِ انساں

اِسی امتحاں گاہ میں اوّل اوّل
مقابل ہوئے اہرمن اور یزداں
اِسی ارضِ اصنام پر پہلے پہلے
ہوئے شرک و توحید دست و گریباں
یہیں سوزِ باطن سے بھڑکے وہ شعلے
ہُوا دل کے آتش کدوں میں چراغاں
یہیں دیو مالا نے تاریخ لکھی
وہ تاریخ اک دفترِ علم و عرفاں
یہیں فلسفے نے وہ منطق تراشی
کہ خود ناطقہ جس کی عظمت سے حیراں
یہیں چشمِ ظاہر نے دیکھے وہ جلوے
کہ انوارِ باطن بھی جن سے پشیماں
یہیں تجربے نے وہ حکمت سکھائی
کہ ہے دانش افروزِ افکارِ انساں
یہی نغمہ و رقص کا معبدِ فن!
وہ صحرا کے نغمے وہ رقصِ غزالاں

سبک سیر ندیوں کی وہ گنگناہٹ
وہ چڑیوں کے گیت اور جشنِ بہاراں
یہیں حکمت و فکر کی خانقاہیں
گُل و غنچہ و دشت و کہسار و میداں
یہیں علمِ فطرت کی تدریس گاہیں
وہ بنجر، وہ صحرا، وہ بَن، وہ بیاباں
وہ دریا وہ دَلدل وہ ٹاپو وہ بیہڑ
وہ نہریں وہ جھیلیں وہ ساحل وہ طوفاں
پہاڑوں کی وہ چوٹیاں حیرت آئیں
کہ ہیں برف زاروں سے آئینہ ساماں
یہی خاک ہے تجربہ گاہِ موسم
ربیع و خریف و بہار و زمستاں
اِسی دیس میں پی کہاں اور پپیہا
اِسی خاک پر نے نواز اور نیستاں
انہی وادیوں میں اِنہی جنگلوں میں
تمدن کے آثار پیدا و پنہاں

یہ تصویرِ ماضی کے کچھ نقشِ ظاہر
یہ رُودادِ کہنہ کے کچھ تازہ عنواں
بتا رُود مہران ! تیرے کنارے
ہوئے کتنے اوراقِ ہستی پریشاں؟
بتا اے زمینِ گرامی کہ تجھ میں
تہِ خاک ہیں کتنی قوموں کے ارماں؟
انہی سرزمینوں پہ بکھرے ہوئے ہیں
ترقی و تہذیب کے کتنے امکاں؟
اِنہی وادیوں میں نظر آرہے ہیں
نئے بادیہ گرد افتاں و خیزاں
بہت ہو چکی مدحتِ مصر و ایراں
سُن اے تذکرہ گوئے تاریخ انساں
یہ میرا وطن ہے کہ جس کے مُقابل
نہ آشور و بابل نہ روما و یوناں

# او ہند جانے والے

اُس خلدِ گمشدہ تک اُس ارضِ دلنشیں تک
اُس خطۂ جواں تک اُس کشورِ حسیں تک
پیاروں کی سرزمیں سے پیاروں کی سرزمیں تک
ہم ہیں جہاں وہاں سے وہ ہیں جہاں وہیں تک
عرضِ نیاز لے جا، جان کلام لے جا
او ہند جانے والے! میرا سلام لے جا
میرا سلامِ الفت یاروں سے جا کے کہنا
حالِ وفا، وفا کے ماروں سے جا کے کہنا
پھولوں سے جا کے کہنا خاروں سے جا کے کہنا
پیاروں کے دل کی باتیں پیاروں سے جا کے کہنا
اخلاص و دوستی کے سچّے پیام لے جا
او ہند جانے والے! میرا سلام لے جا

یہ ہندیوں سے کہنا اُو ہند جانے والے!
بھولے سے بھی نہیں ہم تم کو بھلانے والے!
منکر نہ ہو سکیں گے ہرگز زمانے والے
ہیں پاک و ہند والے سب اک گھرانے والے

ربطِ خواص لے جا ، شوقِ عوام لے جا
اُو ہند جانے والے میرا سلام لے جا

جب سے بچھڑ گئے ہیں اُس خلدِ رنگ و بو سے
محروم ہو گئے ہیں دل شوق و آرزو سے
باز آئیں گے مسافر کیا ذوقِ جستجو سے
اب تک وہی ہے رشتہ دلّی سے لکھنؤ سے

اجداد کے وطن تک اتنا پیام لے جا
او ہند جانے والے میرا سلام لے جا

کیا ہم بھلا سکیں گے اجداد کے وطن کو؟
بھولی ہوئی فضا کو بسرے ہوئے چمن کو؟
گنگا کی دلکشی کو جمنا کے بانکپن کو؟
ماضی کی صحبتوں کو یاروں کی انجمن کو؟

سوغاتِ درد لے جا ، سوزِ تمام لے جا
او ہند جانے والے! میرا سلام لے جا

وہ خاک جس پہ ہم نے بچپن کے دن گزارے
اب تک بسی ہوئی ہے احساس میں ہمارے
کیوں کر نہ یاد آئیں؟ کیوں ہوں نہ دل کو پیارے
اس سرزمیں کے ذرّے اس آسماں کے تارے

پیغام دوستی کے بھارت کے نام لے جا
او ہند جانے والے! میرا سلام لے جا

اے خطۂ جمیل و رعنا! سلام تجھ پر
گم گشتہ رونقوں کی دُنیا سلام تجھ پر
اے وادیِ ہمالہ! صدہا سلام تجھ پر
گنگا سلام تجھ پر! جمنا سلام تجھ پر

جذباتِ خاص لے جا، احساسِ عام لے جا
او ہند جانے والے میرا سلام لے جا

اے ہند کی بہارو! تم کو سلام پہنچے
بچھڑے ہوئے نظارو! تم کو سلام پہنچے
بھارت کے چاند تارو! تم کو سلام پہنچے
برسوں کے بعد یارو! تم کو سلام پہنچے
یہ نامۂ محبّت پیاروں کے نام لے جا
او ہند جانے والے! میرا سلام لے جا

وعدہ شکن نہیں ہم، یہ اعتماد رکھنا
اخلاص کے مراسم حسبِ مراد رکھنا
جو فخرِ دوستی ہو وہ اتحاد رکھنا
ہم تم کو یاد رکھیں، تم ہم کو یاد رکھنا
یاروں کے چند تحفے یاروں کے نام لے جا
او ہند جانے والے! میرا سلام لے جا

# اے بلوچستان

کوئٹہ، سبّی، چمن کی نو بہاروں کو سلام
اے بلوچستان! تیرے کوہساروں کو سلام
سرخیِ خونِ شہیداں، لالہ زاروں میں ترے
کیسے کیسے کوہ کن ہیں کوہساروں میں ترے
اے بلوچستان! تو ہے عظمتوں کی سرزمیں
آفریں تجھ پر کہ تیری خاک دولت آفریں
تیرے قبضے میں عمل بھی، عشق بھی تدبیر بھی
تیشۂ فرہاد بھی، شیریں بھی جوئے شیر بھی
نبضِ فطرت پر ترے محنت کشوں کا ہاتھ ہے
دستِ قدرت اے بلوچستان تیرے ساتھ ہے
رہ نمائی کا سلیقہ گلّہ بانوں میں ترے
انقلابی حوصلے ہیں نوجوانوں میں ترے
اپنی یکتائی پہ نازاں ہر قبیلہ آج بھی
قیس و لیلیٰ ہیں قبیلہ در قبیلہ آج بھی

وہ سکوتِ دشت و دریں کاروانوں کا خروش
بے نیازِ دوش و فردا ہیں ترے خانہ بدوش
سنگ ریزوں میں ترے الماس پاروں کی چمک
برف پر سورج کی ذرّوں میں ستاروں کی چمک
زندگی ہے تیری افسون و فسانہ آج بھی !
تیرے کہساروں میں پتھر کا زمانہ آج بھی
انقلابِ تازہ سے ہشیار بھی بدمست بھی
تو کشادہ قلب بھی ہے اور کشودہ دست بھی
پاسبانِ عظمتِ جمہور ہیں تیرے عوام
تیرے شہروں کو دعا تیرے قبیلوں کو سلام
انقلابی ارتقائی رَو مبارک ہو تجھے
اے بلوچستان ! عہدِ نو مبارک ہو تجھے

# زبانِ اُردو

نکتہ سنجانِ ادب ! دیدہ ورانِ اُردو
عرض کرنا ہے مجھے کچھ بزبانِ اُردو
آٹھ سو سال کی تاریخِ تمدّن ہے گواہ
آٹھ سو سال سے ہے نام و نشانِ اُردو
مگر اس سلسلۂ نام و نشاں کے باوصف
گم رہا سلسلۂ حسن بیانِ اُردو
فارسی دفتر و دربار میں تھی صدر نشیں
دور تھا قصر جہاں باں سے جہانِ اُردو
مگر اس جنس گرامی کو لیئے پھرتے تھے
شہر و بازار میں کچھ رنج کشانِ اُردو
فارسی ملک میں چلتی بھی تو کیوں کر چلتی ؟
حائلِ راہ جو تھا سنگِ گرانِ اُردو

ڈیڑھ سو سال سے انگلش ہے مسلّط ہم پر
ہم ہیں پہلے کی طرح نوحہ گرانِ اُردو
آج انگریز نہیں ہے مگر انگریزی ہے
رہِ عظمت میں عناں گیر زبانِ اُردو
سندھی و بنگلہ و پنجابی و پشتو کی طرح
نیم جاں آج بھی اُردو ہے بجانِ اُردو
آٹھ سو سال سے ہے ایک کشاکش جاری
وہی ہم ہیں وہی کم بخت زبانِ اُردو

عاشقی ہے شیوۂ رنداں ہی سہی
یہ جو عصیاں ہے تو عصیاں ہی سہی
ہم بھی نازاں ہیں گراں جانی پر
آپ جاناں ہی سہی جاں ہی سہی
آپ نے ہجر میں کیا کیا نہ سہا
ہم نے تو زحمتِ ہجراں ہی سہی

# اُردو کا جنازہ

اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
کیوں جانِ حزیں خطرۂ موہوم سے نکلے؟
کیوں نالۂ حسرت دلِ مغموم سے نکلے
آنسو نہ کسی دیدۂ مظلوم سے نکلے
کہہ دو کہ نہ شکوہ لبِ مغموم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے!
اُردو کا غمِ مرگ سُبک بھی ہے گراں بھی
ہے شاملِ اربابِ عزا شاہ جہاں بھی
مٹنے کو ہے اسلاف کی عظمت کا نشاں بھی
یہ میّت غمِ دہلیٔ مرحوم سے نکلے
اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اے تاجِ محل نقش بہ دیوار ہو غم سے
اے قلعۂ شاہی! یہ الم پوچھ نہ ہم سے
اے خاکِ اودَھ! فائدہ کیا شرحِ ستم سے؟
تحریک یہ مصر و عرب و رُوم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

سایہ تو ہو اُردو کے جنازے پہ ولی کا
ہوں میرتقی ساتھ تو ہمراہ ہوں سودا
دفنائیں اِسے مصحفی و ناسخ و اِنشاء
یہ فال ہر اک دفترِ منظوم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

بد ذوقیٔ احباب سے گو ذوق ہیں رنجُور
اردوئے معلّٰے کے نہ ماتم سے رہیں دُور
تلقین سَرِ قبر پڑھیں مومنِ مغفور
فریاد دلِ غالبِ مرحوم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

ہیں مرثیہ خواں قوم میں اُردو کے بہت کم
کہہ دو کہ انیسؔ اس کا لکھیں مرثیۂ غم
جنّت سے دبیرؔ آ کے پڑھیں نوحۂ ماتم
یہ چیخ اٹھے دل سے، نہ حلقوم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اِس لاش کو چپکے سے کوئی دفن نہ کر دے
پہلے کوئی سر سیّد اعظم کو خبر دے
وہ مردِ خدا ہم میں نئی روح تو بھر دے
وہ روح کہ موجود نہ معدوم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اردو کے جنازے کی یہ سج دھج ہو نرالی
صف بستہ ہوں مرحومہ کے سب وارث و والی
آزادؔ و نذیرؔ و شررؔ و شبلیؔ و حالیؔ
فریاد یہ سب کے دلِ مغموم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

ڈوبے ہوئے اسرارِ خودی میں نہ نظر آئیں
اقبال بھی فردوسِ معلّٰی سے اتر آئیں
اردو کی یہ میّت ہے یہ ماتم ہے اِدھر آئیں
شکوہ نہ لبِ شاعرِ معصوم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دُھوم سے نکلے

ہیں بسکہ بہت تنگ دل و تنگ نظر ہم
لِلّٰہ بتا دیجیے اے قائدِ اعظم!
اُردو کو کہاں دفن کرے مِلّت پُرغم
جب روحِ حزیں اس تنِ مسموم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اب فاش ہوئی سب پہ بداقبالیِ اُردو
اُردو میں نہ ہو شرحِ زبوں حالیِ اُردو
انگلش میں لکھو نوحۂ پامالیِ اُردو
اور مدح نہ الفاظ نہ مفہوم سے نکلے
اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

# قلم اور شمشیر

جنگ و تخریب کی شورش ہو کہ امن و تعمیر
دو ہی چیزیں ہیں فقط نوعِ بشر کی تقدیر
یا کسی شاعرِ الہامِ صداقت کی نوا
یا کسی غازیِ میدانِ عمل کی تکبیر
یا کسی کاشفِ اسرارِ مشیّت کا قلم
یا کسی حافظِ ناموسِ اُمم کی شمشیر
یا کسی عابدِ اورادِ وفا کی تسبیح
یا کسی خامۂ تحریرِ حقیقت کی صفیر
ارتقائے بشریّت کے لیے لازم ہیں
یہی دو جوہرِ تابندۂ وجدان و ضمیر
یعنی شاعر کی وہ آواز کہ ہو وحیِ عمل
یعنی غازی کی وہ شمشیر کہ ہو برق نظیر

# شخصیات و عید

# عالمِ تازہ بہ تازہ

شامِ غم گزری فلک پر صبحِ نو ہے آشکار
نو رسیدہ، نودمیدہ، نو شگفتہ، نو بہار
فرش سے عرشِ علا تک بارشِ لطف و سرور
خاک سے چرخِ نہم تک قلزمِ کیف و خمار
از زمیں تا آسماں رعنائیِ شامِ طرب
از مکاں تا لامکاں رنگینیِ صبحِ بہار
عالمِ تازہ بہ تازہ کائناتِ نو بہ نو
ہر نظر آنکھوں سے اوجھل ہر نفس پر جلوہ بار
وہ فلک پر جادہ پیما قافلہ سالارِ صبح
کاروانِ نور و نکہت وہ قطار اندر قطار
سبزۂ نوخیز سے یوں زینتِ صحنِ چمن
جیسے چرخِ سبزہ گوں سے عرش و کرسی کا وقار

نوشگفتہ پھول جیسے آب و رنگِ نوعروس
نوعروسِ گُل کہ صدقے جس پہ سلماتے بہار
نونہالانِ سہی قد لڑ کھڑاتے جھومتے
جس طرح نوواردانِ عرصۂ کیف و خمار
ایسے عالم میں کوئی نو بادۂ گلزارِ حسن
جلوہ ریز و جلوہ بیز و جلوہ خیز و جلوہ کار
پہلوتے ظاہر سے دور آغوشِ باطن سے قریں
حدِّ نظارہ سے اوجھل چشمِ دل پہ آشکار
خود نمائی یہ کہ ناموسِ حیا کا پردہ در
پردہ داری یہ کہ آدابِ وفا کا پردہ دار
دل ربائی یہ کہ باوصفِ توجہ سو گریز
دلنوازی یہ کہ باوصفِ تغافل لاکھ پیار
باوفا اتنا کہ پیمانِ جفا پر کاربند
پاسِ عہد اتنا کہ اقرارِ ستم پر استوار
نرم خو ایسا کہ اہلِ درد پر سو سو کرم
سخت گیر ایسا کہ دامِ زلف میں ہر دل شکار

نازنیں جس طرح شبنم، دلنشیں جیسے نسیم
تیز رو جس طرح بجلی، مست رو جیسے خمار
صبح گلشن کا ترنّم، شامِ صحرا کا سکوت
عہدِ سرما کی لطافت، فصلِ گرما کا وقار
دوپہر کی دھوپ کی عظمت اندھیرے کا سکوں
روشنی کی خود نمائی۔ چاندنی کا انکسار
لہجۂ ناز آفریں میں مجھ سے فرمانے لگا
وہ بتِ نوخیز و نورس، تازہ فکر و تازہ کار
زندگی تجدیدِ اقدارِ کہن میں غرق ہے
اے بہ طرزِ نو! جہانِ کہنہ کے ماتم گسار!
کائناتِ تازہ کی تشکیل ہے اک معجزہ
معجزہ ایسا کہ جس پر معجزِ عیسیٰ نثار
اک نئی دانش کا آغاز اک نئی دنیا کا جشن
اک جہانِ نو کی پیدائش بہ فضلِ کردگار
اک تجلّی زارِ تازہ اک بہارِ رنگ رنگ
اک نیا عہدِ جوانی اک نئی فصلِ بہار

اک نیا منظر نیا جلوہ نیا طرزِ نگاہ
اک نئی محفل نئی رونق نئے نقش و نگار
اک نیا غنچہ، نیا گلشن نئے نخلِ و ثمر
یہ نرالے ساز و ساماں یہ انوکھے برگ و بار
اک نئی تاریخِ انساں اک نیا جغرافیہ
اک نئی تشکیلِ عالم اک نئی ترتیبِ کار
اک نیا جذبِ محبّت اک نیا سوزِ دروں
اک نیا جوشِ تمنّا اک نیا رنگِ خمار
اک نیا لشکر نیا قائد، نیا اعلانِ جنگ
اک نیا پرچم، نیا نعرہ، نیا میدانِ کار
اک نیا صانع نئی صنعت نئی صنعت گری
اک نئی حالت نئی صورت نیا قصّہ نگار
اُٹھنے والا ہے نئی دنیا کے چہرے سے نقاب
وقت کو ہے ایک ضربِ آخری کا انتظار!

# زندۂ جاوید

جو فروزاں ہے دلوں کی وسعتوں میں وہ چراغ
جو دماغوں پر مسلسل حکمراں ہے وہ دماغ
جس کو خود سینچا چمن بندِ حقیقی نے وہ باغ
جس کے سوزِ قلب سے باطل کا سینہ داغ داغ

کامراں اُبھرا عدو کی فوج میں جب گھر گیا
جس سے ٹکرا کر ہر اِک طوفان کا رُخ پھر گیا

وہ کہ جس کو ہم نے پہچانا مگر تاخیر سے
جس کو اپنا رہ نما مانا مگر تاخیر سے
جان سے بڑھ کر جسے جانا مگر تاخیر سے
جس کو سب کچھ اپنا گردانا مگر تاخیر سے

خودشناسی بڑھ گئی اپنی جسے پہچان کر
ہم نے خود اپنے کو پہچانا اُسی کو جان کر

پہلے ہم تھے اپنے عزمِ بے کراں سے بے خبر
خودشناسی کا سبق اُس نے دیا ہر گام پر

پہلے ہم تھے دشمنوں کے ہاتھ میں بے بال و پر
سینۂ بلبل کو بخشا اُس نے شاہیں کا جگر
اُس نے ذرّوں کو لڑایا گنبدِ افلاک سے
دیکھتے ہی دیکھتے اک قوم اُبھری خاک سے
جس نے ہم کو عزم میں کامل بنایا وہ جناح
فاتحِ ابوابِ مستقبل بنایا وہ جناح
جس نے ساری قوم کو یکدل بنایا وہ جناح
اور پاکستان کے قابل بنایا وہ جناح
جس میں ہو لاکھوں دلوں کا ولولہ وہ دل کہاں؟
اِس قبیلے میں اب ایسا جوہرِ قابل کہاں

ہم انقلاب کی رکھتے تھے آرزو کتنی ؟
یہ انقلاب ہوا ! انقلاب زندہ باد

# جناح

صدیوں سے زندگی کی روش نادرست تھی
رفتارِ وقت تیز سہی نبض سست تھی
صدیوں سے اِس چمن میں خزاں کا رواج تھا
تاروں کی مملکت میں اندھیروں کا راج تھا
پھیلے ہوئے جو ظلم و تشدّد کے جال تھے
صدیوں سے انقلاب کے نعرے نڈھال تھے
کھلتے تھے پھُول دِل کی گرہ کھُولتے نہ تھے
بجتے تھے سازِ تار مگر بولتے نہ تھے
مفلوج تھے جو ذہن تو شل تھے دماغ تک
بجھنے لگے تھے فکر و نظر کے چراغ تک
منزل کی دُھن میں اہلِ طلب بھاگتے نہ تھے
راہیں تو جاگتی تھیں قدم جاگتے نہ تھے
راہی گلہ طراز کہ رہبر ہی تھک گئے
شکوہ تھا رہبروں کو کہ راہی بھٹک گئے

ناگاہ ظلمتوں کے قدم کانپنے لگے!
طوفاں جو تیز دَو تھے تھے ہانپنے لگے!
راتوں کی مٹھیاں جو کھُلی تھیں وہ بھنچ گیئں
ظلمت میں روشنی کی لکیریں سی کھنچ گیئں
نظریں رہا ہوئیں قفسِ انتظار سے
نکلا امیرِ قافلہ گردو غبار سے
ہمّت کی بادِ تُند جنوں خیز ہوگئی
ملّت کی نبض تیز بہت تیز ہوگئی
اِک قومِ نو عَدم سے جو آئی وجُود میں
ہلچل سی مچ گئی چمنِ ہست و بود میں
اِس روحِ انقلاب کا محرم جناح تھا
اِس قومِ نو کا قائدِ اعظم جناح تھا

# عہد

مزارِ قائداعظم پہ عہد کرتے ہیں
کہ ہم کبھی نہ مصائب سے تنگ دل ہوں گے
ہجومِ یاس سے ہرگز نہ مضمحل ہوں گے
دفاعِ قوم و وطن سے نہ جی چرائیں گے
بلائیں جتنی پڑیں گی وہ جھیل جائیں گے
شکست کھا کے پلٹنا ہمارا کام نہیں
کہ جوئے تند ہیں موجِ سُبک خرام نہیں
ہمیں جہاد کی توفیق اگر خدا دے گا
سلف کا خون نہ ہرگز ہمیں دغا دے گا
مزارِ قائداعظم پہ عہد کرتے ہیں
کہ ہم نہ غیر کی قوت کا آسرا لیں گے
خود اپنے ہاتھ میں تیغ و عَلم اٹھا لیں گے

جہاں جہاں بھی شہادت ہمیں پکارے گی
ہماری قوم بصد عزم جان وارے گی
جہانِ امن و اخوت کے پاسباں ہم ہیں
جہاں میں امن و اخوت کے ترجماں ہم ہیں
نقوش عہدِ غلامی کے یوں مٹا دیں گے
اِسی جہاں کو بہشتِ بریں بنا دیں گے
مزارِ قائدِ اعظم پہ عہد کرتے ہیں
بپا ہے حشر قدامت کے قید خانے میں
کہ ارتقا کے ہراول ہیں ہم زمانے میں
جو تیغِ برق صفت ہاتھ میں اٹھالیں گے
نظامِ جبر و تشدّد کو پھونک ڈالیں گے
وطن کے درد رسیدوں کو بھول سکتے ہیں؟
ہم اپنے لاکھوں شہیدوں کو بھول سکتے ہیں؟
کشادہ دَست کبھی مٹھیاں نہ بھینچیں گے
ہم اپنے خون سے اپنے وطن کو سینچیں گے
مزارِ قائدِ اعظم پہ عہد کرتے ہیں

## شہیدِ ملّت

# لیاقت علی خان

دفن جس خاک میں کل اُس کو کیا تھا ہم نے
آج اُس خاک سے ہے زندگیٔ نو کی نمُود
جس کی ہیبت سے دلِ زندہ لرز اُٹھا تھا
فاش اُس موت نے مِلّت پہ کیا رازِ وجود
واہ کس شان سے مقتل میں مڑوڑا اُس نے
پنجۂ دیوِ اجل ، با جگرِ خوں آلوُد
مر کے جو قوم کے احساس کو زندہ کر دے
ایسے غازی پہ سلام ایسے مجُاہد پہ دُرود
روح میں ہے ابدیّت کا شرارہ کوئی
ورنہ یہ سوزِ حیاتِ ابدی ہے بے سُود
ہیں زمانے میں وجُود اور عدم کے معیار
یہ نہیں ہے تو نہ معدُوم نہ کوئی موجود
رشتۂ ذوقِ شہادت ہی اگر گم ہو جائے
کھُل سکے گا نہ کبھی عقدۂ بوُد و نابوُد

اے وفاکشتۂ ملّت! تری قربانی سے
بن گئی منزلِ دُشوارِ عدم راہِ وجُود
تیرے مشہد سے ابھی تک یہ صدا آتی ہے
کہ شہادت ہے فقط اہلِ وفا کا مقصُود
برسرِ تربتِ ما چوں گذری ہمّت خواہ
کہ زیارت گہِ رندانِ جہاں خواہد بوُد

## اے واعظِ تقلید زدہ

اے واعظِ تقلید زدہ! تیری قیادت
سب کچھ ہے مگر نازِ قیادت تو نہیں ہے
تو صاحبِ اخلاص ہے کچھ شک نہیں اس میں
اخلاص ترا صرف حماقت تو نہیں ہے
اسلام ہے اِک طرزِ سیاست مگر اسلام
بازیچۂ اربابِ سیاست تو نہیں ہے

# ہم لوگ

شامِ بیداریِ ملّت کی سحر ہیں ہم لوگ
غدر کے نخلِ بغاوت کا ثمر ہیں ہم لوگ
آؤ اِک منزلِ تازہ کی طرف جست کریں
مقصدِ منزلِ یارانِ سفر ہیں ہم لوگ
مہ و خورشید کی پڑتی ہیں نگاہیں ہم پر
نقطۂ جاذبۂ اہلِ نظر ہیں ہم لوگ
اب اِسی خاک سے تعمیرِ جہاں کرنی ہے
کون کہتا ہے فقط خاک بسر ہیں ہم لوگ
جس کو تاریخ نے کہنہ کبھی ہونے نہ دیا
عہدِ تازہ میں وہ دیرینہ خبر ہیں ہم لوگ

❖

یہ عہد ہے بیداریٔ افکار و عمل کا
اور آپ ابھی اپنے ہی افکار میں گم ہیں
جو لوگ کہ اِس عہد میں ہیں عضوِ معطل
وہ پنجۂ تاریخ کی انگشتِ ششم ہیں

# امیر خسروؒ

ترانۂ روحِ دو جہاں ہیں نوائے جاں ہیں امیر خسرو
حیات خود نغمہ خواں ہے جن کی وہ نغمہ خواں ہیں امیر خسرو
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
اندھیری رتیاں نہ کیوں ہوں روشن کہ ضَو فشاں ہیں امیر خسرو
وہ ہندی الاصل فارسی گو وہ برج بھاشا وہ کہہ مکرنی
مگر جو کہہ کر کبھی نہ مُکری وہی زباں ہیں امیر خسرو
وہ شاعر و عارف و قلندر وہ خسروی شان وہ فقیری
نہ کیوں ہوں جانِ جہاں کہ آخر جہانِ جاں ہیں امیر خسرو
جمالِ اجمیر و حُسنِ دہلی کہ جس پہ ہندوستاں ہے نازاں
اُسی جمالِ ابد نما کے قصیدہ خواں ہیں امیر خسرو
رئیسؔ ان کا دوامِ عظمت نہ کیوں ہو اک عظمتِ دوامی
دوام خود ترجمہ ہے جس کا وہ ترجماں ہیں امیر خسرو

# مقامِ درویشی

طبیبِ عشق مسیحائے اہلِ دل اقبال
کمالِ فقر ہے تیرا مقام درویشی!
رہ طلب میں ترے نقشِ پا سے روشن ہے
چراغِ خودنگری ، مشعلِ خود اندیشی!
کمی کا تیرے مدارج میں احتمال ہی کیا
مراتبِ بشریت میں تو نے کی بیشی
غضنفری و نہنگی کا طرز سیکھ گئی
وہ قوم جس کی روش گوسفندی و میشی
عروجِ فکر و تخیّل سے دب گئی تیرے
عدو کی بدنظری غیر کی بد اندیشی
طبیبِ عشق کی خلوت میں کل ہوئی ایدوست!
مریضِ دردِ محبت کی دفعتاً پیشی
طبیبِ عشق سے فوراً گلہ کیا میں نے
نہ اب وہ دردِ طلب ہے نہ دُور اندیشی
طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

# تیرا نام

عقل کو جس سے نصیب ایقان و ایماں کا شعور
عشق کو جس سے میسّر۔ غم کا لافانی سُرور
روح جس سے زندہ و بیدار و پُرسوز و جواں
فکر جس سے سرِّ تخلیق و عَدم کی راز داں
گوہرِ شہوار آنکھوں کو میسّر جس سے ہیں
تابناک و بے بہا اشکوں کے گوہر جس سے ہیں
جس نے بخشا روحِ مُردہ کو خودی کا ولوَلہ
قوم کو جس کی ودیعت زندگی کا حوصلہ
زندگی بالیدہ جس کی شبنمِ گفتار سے
گود بھر دی قوم کی جس نے نئے افکار سے
جذبۂ بیتابِ منزل سست گاموں کو دیا
انقلابی حوصلہ جس نے غلاموں کو دیا
الغرض جس میں نہاں فطرت کا ہر الہام ہے
ہاں! وہ تیرا نام اے اقبال! تیرا نام ہے

# اے مریدِ پیرِ رومی!

ذہن میں جب خشک ہو جاتے ہیں سوت الہام کے
قوم رہ جاتی ہے جب ماضی کا دامن تھام کے
دل کے آئینے کو لگ جاتے ہیں زنگ اوہام کے
جب بدل جاتے ہیں معنی سرمدی پیغام کے

جب نہیں رہتا شرارِ زندگی تک روح میں
گھُٹ کے رہ جاتا ہے احساسِ خودی تک روح میں

ایسے عالم میں کوئی پیغمبرِ عہد آفریں
چھیڑتا ہے بربطِ اعجاز سے تارِ یقیں
یا حکیم و فلسفی کوئی بہ طرزِ دل نشیں
اہلِ ملت کو سکھاتا ہے رموزِ علم و دیں

یا کوئی معجز نما شاعر نئے انداز سے
روح تازہ پھونکتا ہے شعر کے اعجاز سے

تو ہے اے اقبال ! وہ دانائے رازِ زندگی
بے خودانِ عشق کو جس نے دیا درسِ خودی
عارف و درویش و شاعر اے حکیم و فلسفی!
بن گئی سرمایۂ اعجاز تیری شاعری
اے مریدِ پیرِ رومی ! تو ہمہ ایقان ہے
تیرا شعرِ زندہ و پائندہ پاکستان ہے

## باز آید کہ ناید

دمِ رحلت یہ تھی اقبال کو فکر
"دگر دانائے راز آید کہ ناید"
ظہورِ قائداعظم سے لیکن
ہوئی ہوگی انھیں تسکین شاید
مگر اب قائدِ اعظم نہ اقبال
نہ کوئی منزلِ مقصد نہ مقصد
یہ شعر اقبال نے ہنگامِ آخر
اسی الجھن میں فرمایا تھا شاید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید

# نیاز فتحپوری

فکرِ تازہ کا نشاں فن کی نشانی تھا نیاز
لفظ کے جسم میں خود رُوحِ معانی تھا نیاز

اُس کے اعجازِ سخن سے تھے سخنور عاجز
ہمہ تن معجزۂ تازہ بیانی تھا نیاز

خود تھا اک زندہ روایت وہ روایات شکن
اک نئے مکتبۂ فکر کا بانی تھا نیاز

پیرِ فرزانۂ حکمت تھا بہ دورانِ شباب
اور پیری میں تخیّل کی جوانی تھا نیاز

اس کی نقّادِ طبیعت کبھی رُکتی ہی نہ تھی
اپنے دریائے تخیّل کی رَوانی تھا نیاز

ادب و شعر و صحافت کہ بیان و ابلاغ
صُورت لفظ میں اک رمزِ نہانی تھا نیاز

شاعر و فلسفی و ناقد و فن کار و ادیب
ہمہ گیری، ہمہ بینی، ہمہ دانی تھا نیاز

حاصلِ فکرِ دَوام اُس کے نقوشِ باقی
جس پہ نازاں ابدّیت ہے وہ فانی تھا نیاز
کوئی اس شخص کا ہمسر ہے نہ ہم سازِ رئیس
مختصر ہے یہ ثنا اپنا ہی ثانی تھا نیازؔ

لفظ کو اُس نے معانی کا تصوّر بخشا!
خامۂ جسم سے صُورت گرِ جاں تھا یہ شخص
میرِ بُت خانۂ و مُلّائے حرم کچھ بھی کہیں
واعظِ منبرِ صاحب نظراں تھا یہ شخص
اُسکی مستی کبھی دریوزہ گرِ مے نہ ہوئی
اپنے افکار کی شوخی سے جواں تھا یہ شخص
عقل کہتی ہے کہ سوزِ ابدی کا پیکر
عشق کہتا ہے کہ ہاں سوختہ جاں تھا یہ شخص

# اکبر الٰہ آبادی

بہت پیچیدہ پس منظر ہے منظوماتِ اکبر کا
نظر محدود ہے ناقد کی اُس کے پیش منظر تک
دلِ مُردہ کا یہ اک زندۂ جاوید نوحہ ہے
جو آیا طنز کی صورت زبان نکتہ پرور تک
یہ اک مرتی ہوئی تہذیب کی ہے مرثیہ خوانی
جو پہنچی لہجۂ فریاد میں محراب و منبر تک
مزاح عامیانہ اور منظوماتِ اکبر میں!
رسائی خار و خس کی اور دامان گُلِ تر تک!
یہاں ہے طنز اور تخلیقِ تازہ کی فراوانی
نہیں پہنچا ابھی ذہنِ مفکر اس کے جوہر تک
ظرافت طنز سے خالی رہے تو یاوہ گوئی ہے
فقط محدود ہو جو ہاؤ ہوئے قہقہہ گر تک
رئیس المختصر اک سلسلہ ہے نقد معنیٰ کا
لسان العصر اکبر سے لسان العصر اکبر تک

# جگرؔ مرحوم

عشق کو جس کی وَدیعَت سوزِ پنہاں کا گُداز
حُسن کو جس نے سکھایا شیوۂ راز و نیاز
جس نے بخشی روح کو دردِ حقیقت کی کسک
جس کی فکرِ تازہ میں انگور زاروں کی مہک
جس نے مضرابِ تخیّل کو نیا نغمہ دیا
اک نیا لہجہ غزل کی روح کو سکھلا دیا
جس نے اشکوں کو عطا کی موتیوں کی آب و تاب
وہ جگرؔ جس کا تغزل اک غزالِ پُرشباب
ماورائے شعر ہے جو اُسکے شعروں میں وہ بات
شعر پر وہ یوں ہُوا وارد کہ جیسے واردات
لفظ و معنی کو نیا آہنگ زیبائی دیا
وہ جگرؔ جس نے غزل کو رنگِ رعنائی دیا
اُس کا دَورِ زیست تھا اک ساغرِ مُل کی طرح
جس کی ساری زندگی گزری تغزّل کی طرح

# جوشؔ ملیح آبادی اور ترکِ مے؟

مے، حریفِ جوشِ رنداں ہے، یہ کیا سنتا ہوں میں
جوشؔ صاحب اور ترکِ مے! یہ کیا سنتا ہوں میں
جام سے جمشید خود بیزار کس نے کہہ دیا
خُم سے افلاطون کو انکار کس نے کہہ دیا
مے کدہ مردودِ رندانِ جہاں؟ ممکن نہیں
مے خلافِ مشربِ پیرِ مغاں ممکن نہیں
ساغرِ زہرِ اجل سقراط خالی چھوڑ دے
آئینے کو جوشِ وحشت میں سکندر توڑ دے!
عظمتِ کشکول و کاسہ بزمِ کیکاؤس میں!
معرکہ برپا فرابا دین و جالینوس میں!
فنِّ فرہنگ اور اُس پر فاریابی کا عتاب!
بوعلی سینا کو قانونِ شفا سے اجتناب
علم کا پیمانہ اور پیماں شکن لقمانؔ سے!
ارشمیدس اور نفرتِ آلہ و میزان سے!

سہ جوالہ اور زرتشت سے گرمِ مصاف!
موبد و مزدک کو مہر و مہرگاں سے اختلاف
داد و دانش کی عدو دانش پژوہی کی ہم
سامری اور منکرِ افسون و نیرنگ و طلسم!
خسروِ پرویز اور شیریں سے اتنا تلخ کام!
محفلِ افراسیابی، بندشِ مینا و جام!
رودکی طنبورو نے کو بار بد مضراب کو
پھینک دے جھنجلا کے فیثا غورس اصطرلاب کو
اپنی فردوسِ عدن کھلنے لگے شداد کو
موُ قلم سے وحشت وبیگانگی بہزاد کو!
جوشؔ اور ساغر سے مہجوری خدا کی شان ہے!
مانیؔ وارژنگ میں دوری خدا کی شان ہے!
عرصۂ ہیجا میں ہوں پرخاش جو و سرگراں
رخش و رستم سام و ساطور اور کاؤس وکماں
لوگ کہتے ہیں تو کہنے دیجیے۔ کیا کیجیے
جوشؔ صاحب اور توبہ! توبہ، توبہ کیجیے

غنچۂ رعنا ادائے کج کلاہی چھوڑ دے!
پھول اور شبنم سے غسل صبح گاہی چھوڑ دے!
لالۂ صحرا سے بادِ نرم و نازک کو عناد!
چاند کی کرنوں میں اور دریا کی لہروں میں فساد!
نور و نکہت سے گریزاں نو عروسانِ چمن!
مشکِ نافہ سے بدک جائیں غزالانِ ختن!
قاسمِ آبِ حیات اور نوشدا روئے اجل!
شہد سے سرکہ جبیں سلطان افواج عسل!
پیکرِ انوار آزردہ شعاعِ نور سے!
باغبانِ تاک برہم شیرۂ انگور سے!
ماہیِ قلزم نشیں کو موجِ دریا سے گریز!
طائروں کو جوئبارو دشت وصحرا سے گریز!
اپنی مرضی سے صدف موتی اگلنا چھوڑ دے
جوش کھاکر قدرتی چشمہ اُبلنا چھوڑ دے
بازگشتِ کوہ سے مُنکر صدائے کوہسار
اپنا ہیجان و تلاطم ضبط کرلے آبشار

زندگی میں پیش و پس مردانِ سادہ کا اصُول
ہرچہ بادا باد ہے یارانِ بادہ کا اصُول
جوشؔ جیسا عارفِ مے حیف بر احوالِ مے
تارکِ آیئنِ مستی ، تائبِ اشغالِ مے
جوشؔ جس کی گرمجوشی ، گرمیِ بزمِ سُخن
جس سے دورِ جام و صہبا انجمن در انجمن
جس نے اہلِ خمؔ کو سکھلائے آدابِ سُرور
جس نے بخشا مسلکِ رنداں کو عرفانی شعور
جس کے پیمانے میں ہر مے ناکشیدہ ہی رہی
دُختِ رز جس کی کنیز ناخریدہ ہی رہی
جو پرستانِ طرب پر دیوبن کر چھا گیا
جن کو رَم کرتے اُسی کے سامنے دیکھا گیا
جوشؔ جیسا خسروِ اقلیمِ ہوش و آگہی
اور مے خانے کی دریوزہ گری اچھی کہی!
جوشؔ پر بہتانِ جام و بادہ اے اربابِ ہوش!
مے پرستی اور عارف جرعہ نوشی اور جوشؔ!

جس کے ہاتھوں ہیں فروغِ علم و دانش کا عَلم
جانبِ مے خانہ اٹھیں ایسے مرشد کے قدم!
جوش جیسا نرم خو و نرم خواب و نرم خیز
اور اک آب کشیدہ گرم و تلخ و تند و تیز!
جوش سا شکرّ بیاں اور جوش سا شیریں سخن!
اور اک زہرِ ہلاہل، تلخیٔ کام و دہن!
جوش یعنی سلسبیل آشام و کوثر نوش جوش
اور اک دُردِ منفطّر شعلہ ناک و شعلہ پوش!
جوش جس کا نطقِ شیریں جوئبارِ انگبیں
اور اِک شورابۂ پُرشور و تلخی آفریں!
جوش سا مرد وسیع المشرب و شُستہ مذاق
اور اِک مشروبِ شدّت خیز و شر آمیز و شاق!
جوش اِک نغمہ گرِ الہام جیتا جاگتا
جوش اپنا حافظ و خیّام جیتا جاگتا
عین مستی میں بھی علم و آگہی کی شان ہے
جوش کی بادہ پرستی جوش پر بہتان ہے

# کیا معلوم

عہدِ گل ہے کہ خزاں ہے یہ مجھے کیا معلوم
عید ہے یا رمضاں ہے، یہ مجھے کیا معلوم
چہرۂ وقت بظاہر تو ہے گلگوں لیکن
کون خونابہ فشاں ہے، یہ مجھے کیا معلوم
لبِ ہستی پہ اِک آوازِ خفی ہے تو ولے
کون مجبورِ فغاں ہے، یہ مجھے کیا معلوم!
زندگی شعلہ بجاں ہے، مجھے تسلیم مگر
کس لیے شعلہ بجاں ہے یہ مجھے کیا معلوم
ہاں رہِ نو ہے کمانِ قدر اندازِ قضا
زد میں کون اِس کی تپاں ہے، یہ مجھے کیا معلوم
قافلہ اہلِ تمنا کا رواں ہے تو مگر
کس تمنّا میں رواں ہے، یہ مجھے کیا معلوم؟
عشق خود فدیۂ اربابِ ہوس ہے اے دوست!
فدیۂ عشق کہاں ہے، یہ مجھے کیا معلوم

# مرحبا!

مرحبا اے زخمِ دل، داغِ جگر کی عید ہے
دیکھ اے چشمِ تصوّر چشمِ تر کی عید ہے
شاد باد اے بزمِ عشرت! جشنِ ماتم ہے بپا
زندہ باد اے پرشکستہ! بال و پَر کی عید ہے
آشیانے جل رہے ہیں صحنِ گلشن زندہ باد!
شاخِ گل شعلہ بدامن ہے شرر کی عید ہے
جشن سے کہہ دو کہ، سرو سامانِ ماتم ہے کہاں
عید سے کہہ دو کسی آشفتہ سَر کی عید ہے
ہم سمجھتے تھے کہ تزئینِ دلِ وجاں ہے قریب
یاں ابھی تک زینتِ دیوار و دَر کی عید ہے
قلب روتا ہے کہ زخموں کی نمائش کا ہے دِن
زخم ہنستا ہے کہ اک خونیں جگر کی عید ہے
مجملاً یہ ہے کہ مجمل ہے ابھی مفہومِ عید
مختصر یہ ہے گروہِ مختصر کی عید ہے

# مُبارک ہو

نئی سحر ہے تجلّی فشاں مبارک ہو
کہو کہو کہ مبارک ہو ہاں مبارک ہو
چراغِ بادہ سے آتش کدے ہوئے روشن
فروغِ محفلِ روحانیاں مبارک ہو
حجاب خاک اٹھا چہرۂ عناصر سے
ظہورِ عالمِ نورانیاں مبارک ہو
بہ فکرِ قُربِ الٰہی جو تھے تہی آغوش
انہیں معانقۂ دلبراں مبارک ہو
سبک سَرانِ مے و میکدہ سے کیا کہیے
یہی کہ گردشِ رطلِ گراں مبارک ہو

تجلّیاتِ شبِ قدر کا پیام ہے کیا
یہی کہ صُبح وصالِ بتاں مبارک ہو
عطائے حضرتِ پیر مغاں ہے جرعۂ مے
عطائے حضرتِ پیر مغاں مبارک ہو
شریک زمرۂ دُردی کشاں ہوا ہے رئیسؔ
جوارِ رحمتِ دُردی کشاں مبارک ہو

کوئی ہم کو آکے دیکھے کوئی ہم سے آکے پوچھے
ستمِ وداعِ یاراں - اَلمِ فراقِ خانہ
سرِ شاخِ گُل ہمیشہ جو رہا ہو نغمہ پیرا
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے غمِ ترکِ آشیانہ

# مُبارک

یہ عید اے شکوہ سنجِ غم مبارک
نیا نوحہ، نیا ماتم مُبارک
تمہیں اے ساکنانِ محفلِ عیش
مےِ جاں بخش و جامِ جم مبارک
تمہیں اے تشنگانِ بادۂ کیف
سرشکِ درد و چشمِ نم مبارک
تمہیں اے خسروانِ مسندِ کبر
غرورِ افسر و پرچم مُبارک
ہمیں اے رہروانِ کوچۂ یاس
شکستِ نو بہر عالم مبارک
تمہیں نغمے خوشی کے راس آئیں
ہمیں آہنگِ سازِ غم مُبارک
یہ صُورت ہو تو پھر عیدِ طرب کیا!
مبارک باد کیا! تاہم مبارک

# روایت

عید کیا ہے؟ اک روایت ذہن پر چھائی ہوئی
وقت کی رَوندی ہوئی صدیوں کی ٹھکرائی ہوئی
کیا وہ ملّت جو حریفِ عظمتِ توحید ہے
امتحاں گاہِ عمل میں مستحقِ عید ہے؟
کیا وہ ملّت جو نہیں رَمز آشنائے رُوحِ صوم
عیدِ روحانی کا استحقاق رکھتی ہے وہ قوم؟
کیا وہ ملّت اکثریت جس کی ہے زار و زبوں
جسم آلودہ بخاک و روح آغشتہ بخوں
اپنے دستِ مرتعش میں دامنِ اُمید لے؟
اُس کو کیا حق ہے مبارکبادِ روزِ عید لے
عید ابھی رسمِ مسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دیرینہ روایت کے سوا کچھ بھی نہیں
کب دکھائے گا مناظر عیش و خوشحالی کے چاند
عید کب آئے گی! سچی عید لے خالی کے چاند!

# کہیں نہ کہیں

آہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
اہلِ عشرت ہوں نکتہ چیں نہ کہیں
اشکِ خونیں مرے نہ پونچھ اے دوست
خوں سے بھر جائے آستیں نہ کہیں
محفلِ عیش اور نوحۂ عید
تنگ آ جائیں ہم نشیں نہ کہیں
عید پر بھی جو مُسکرا نہ سکے
وہ الم کوش ہوں ہمیں نہ کہیں؟
سوچ اے طالبِ شرابِ نشاط
زہر بن جائے انگبیں نہ کہیں
غم زدوں کو نہ دو مبارکباد
طنز ٹھیرے یہ آفریں نہ کہیں
کب تک آخر یہ شرحِ دردِ حزیں
عید آئی تو ہے کہیں نہ کہیں

# جلوہ گر

ہلالِ عید ہوا جلوہ گر مُبارک ہو
دلِ حزیں! یہ فریبِ نظر مُبارک ہو
جنہیں حوادثِ دوراں نے پیس ڈالا ہے
انہیں یہ حادثۂ تازہ تر مبارک ہو
جو چُور چور ہیں زخموں سے اُن کو ازسرِ نو
شگافِ سینہ و زخمِ جگر مُبارک ہو
فروغِ صبح سے ہیں جن کے روز و شب محروم
انہیں فریبِ طلوعِ سحر مبارک ہو
غریب قوم! تجھے روزۂ مسلسل میں
نشاطِ عید کی تازہ خبر مبارک ہو
وفورِ غم ہے دلِ غم پسند بسم اللہ
ہجومِ اشک ہے اے چشمِ تر مبارک ہو
برنگِ تازہ پھر اُبھری جراحتِ کہنہ
ریاضِ جاں کو یہ تازہ ثمر مُبارک ہو

# جشنِ قربانیِ غنچہ

عہدِ گل؟ عہدِ گل اے بادِ صبا کچھ بھی نہیں
جشنِ قربانیِ غنچہ کے سوا کچھ بھی نہیں
دُرِ شہوار تلاطم میں جنم لیتا ہے
مہر خاکسترِ انجم میں جنم لیتا ہے
جس سے بیداریِ افکار کا ملتا ہے ثبوت
کتنے الفاظ و معانی کا لہو ہے وہ سکوت
خوں بہا کتنی شکایات کا اک پیار کی بات
کتنے اشکوں کا ذبیحہ ہے تبسم کی حیات
آنکھ اٹھانے سے کہیں ساعتِ دید آتی ہے؟
عمر گھٹ جاتی ہے اک سال تو عید آتی ہے
شیوۂ کہنہ و آئینِ جواں قربانی
قوتِ نامیۂ کون و مکاں قربانی
عیش ہے لذّتِ معدہ ہے نہ تن آسانی ہے
عظمتِ عید ہی باقی ہے نہ قربانی ہے

# اے ماہِ مُبیں

جلووں سے ترے محفلِ ہستی میں اُجالا
اے ماہِ مُبیں! سلّمک اللہ تعالیٰ
کیا کرتا ہے مے خوار کے روزوں کا بدل؟ کر
کیا لایا ہے زاہد کی نمازوں کا صلہ؟ لا
دورانِ فلک اور کرے تجھ کو درخشاں
اللہ کرے اور ترا مرتبہ اعلا
ہم کو بھی میسّر ہو وہی اوجِ ترقّی
جس اوجِ ترقّی کا ہے تو دیکھنے والا
ہم خاک نشینوں کو بھی لِلّٰہ بتا دے
اے عالمِ بالا! خبرِ عالم بالا
منظور ہے کیا ناظمِ دیوانِ قضا کو
کیوں سیلِ حوادث سے جہاں ہے تہ وبالا
جا اور بُروجِ فلکی میں ہو درخشاں
للّٰہ نگہبان محمدؐ کا حوالہ

# رسمِ کہن

یہ عید رسمِ کہن کے سوا کچھ اور بھی ہے
نشاطِ کام و دہن کے سوا کچھ اور بھی ہے

جمالِ سرو و سمن پر نہ کر قیاسِ بہار
بہارِ سرو سمن کے سوا کچھ اور بھی ہے

شہیدِ لفظ، سکوت اختیار کر کہ یہاں
سخن! کمالِ سخن کے سوا کچھ اور بھی ہے

ترا حریف زرہ پوش ہے دمِ پیکار
ترے بدن پہ کفن کے سوا کچھ اور بھی ہے

وہ دیکھ گوشۂ پُرخار و تودۂ پُرخاک
چمن میں صحنِ چمن کے سوا کچھ اور بھی ہے

حیات صرفِ تن آسانئ طرب تو نہیں
یہاں لذائذِ تن کے سوا کچھ اور بھی ہے

ہلالِ عید یہ پیغام دے رہا ہے رئیسؔ
کہ عید رسمِ کہن کے سوا کچھ اور بھی ہے

# بہرحال

عیدِ رمضان و مہِ شوّال مبارک
یہ عیدِ مبارک ہو بہرحال مبارک

تزکیۂ افکار بہت دُور ہے تاہم
ہنگامۂ تزکیۂ اعمال مبارک

اے دانشِ پختہ! طربِ خام میں کھوجا
اے پیرِ کہن! شیوۂ اطفال مبارک

اے زخمِ جگر! تازہ جراحت کے مزے لے
اے دیدۂ تر! جلوۂ اقبال مبارک

اے دستِ تہی! دامنِ خالی سے اُلجھ جا
اے پائے شکستہ! رہِ پامال مُبارک

یک رنگیِ ماحول سے بیزار تھیں رُوحیں
یہ لمحۂ نیرنگیِ احوال مُبارک

ہر سال ہی جب عید مبارک کی ہے تقریب
اِس سال بھی عید آئی ہے اِس سال مبارک

# کچھ اور نہیں

ہلالِ عید خبر کے سوا کچھ اور نہیں
یہ سب فریبِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں
چمن میں جشن کہاں تک کہ یہ جلوسِ بہار
جنازۂ گُلِ تر کے سوا کچھ اور نہیں
نویدِ عیش ہے باطل کہ منظرِ مسرّتو
فسُونِ شعبدہ گر کے سوا کچھ اور نہیں
فروغِ شمعِ طرب کا یقیں کیسے آئے
فضا میں رقصِ شرر کے سوا کچھ اور نہیں
متاعِ شامِ بلا رائیگاں نہ کر کہ سحر
خیالِ خامِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں
اگر شعُور نہ خضرِ طریق ہو تو حیات
غنودگی میں سفر کے سوا کچھ اور نہیں
زبانِ خلق پہ آوازۂ مبارکباد
مری زباں پہ مگر کے سوا کچھ اور نہیں

# اے مہِ نو

تیرے آئینے پہ صدیوں کی روایات کا زنگ
اے مہِ نو! تیرے جلووں میں کوئی روپ نہ رنگ
کس لیے مدعیٔ حسن و ضیا ہوتا ہے
تو نمائش سے خود انگشت نما ہوتا ہے
آج انساں کی رسائی ہے ستاروں سے بلند
ہم نے پھینکی ہے مہ و مہر و ثریا پہ کمند
اوجِ گردوں کے قریں خاک نصیب آپہنچے
ہم ترے اور قریب اور قریب آپہنچے
ذرّۂ خاک ہوا گرمِ سفر ہوش میں آ
محورِ دہر ہے آدم مرے آغوش میں آ
یوں ترا اخترِ تقدیر دمک اٹھے گا
داغ بن کر مرے سینے میں چمک اٹھے گا
ماہ ہے غیرتِ خورشید بناؤں گا تجھے
اے مہِ عید! مہِ عید بناؤں گا تجھے

# برخیز

ہر چند کہ ہے صبحِ بہاراں طرب انگیز
پھیکا ہے مگر نغمۂ مرغانِ سحر خیز
عہدِ تعب افزا کا تقاضا ہے کہ خاموش
عیدِ طرب آرا کا اشارہ ہے کہ برخیز
ہم کو بھی فن آتا ہے مسرّت طلبی کا
صد حیف کہ سلمائے مسرّت ہے کم آمیز
آں سوئے اُفق ہے کوئی آغوش کشادہ
اے قافلۂ زیست! ذرا تیز ذرا تیز!
فریاد کہ دولت کے شیاطین ہیں آزاد
صد حیف کہ نخوت کے سلاطین ہیں خونریز
حائل ہیں حصولِ طربِ نوعِ بشر میں
مغرب کے ہلاکو ہوں کہ مشرق کے ہوں چنگیز
ہم آج بھی ہنگامۂ ماتم پہ ہیں قادر
مانع ہے مگر حرمتِ عیدِ طرب انگیز

# فریاد

بکرے کی ہے آدمی سے فریاد
اے اشرفِ خلق ابنِ آدم
میں کُشتۂ بے زبانِ قصّاب
تو زندۂ جاودانِ عالم
آرائشِ جسم و روح ہے تو
آلائشِ چرم و استخواں ہم
پیرایۂ مرگ و زیست تیرا
تخلیقِ جہاں سے بھی مقدّم
سرمایۂ ہست و بُود اپنا
پشمینہ و پوستینِ آدم
تو ہے کہ حیات کا پیمبر
ہم ہیں کہ ذبیحۂ مجسّم!
اِک تو ہے کہ جلوہ گُسترِ عید
اک ہم ہیں کہ نوحہ خوانِ ماتم

تو مذبح و قتل گاہ و مسلخ
ہم بسمل و نیم جان و بیدم
تو دشنۂ و تیر و کارد و تیغ
ہم کشتۂ ظلم و لاشۂ غم
تو باہمہ ظلم جہل و انکار
قدرت کی نگاہ میں مکرّم
ہم باہمہ جبن و حلم و ایثار
درماندہ و راندۂ دو عالم!
خلقت کو نگل لیا ہے تو نے
پھر بھی نہیں تیری اشتہا کم
شیطان کی آنت ہیں کہ آنتیں
معدہ ہے کہ معدہ جہنّم
ہم بھی ہیں اُسی خدا کی مخلوق
تو جس کا خلیفۂ معظّم
ہم صرفۂ مطبخ و ضیافت
تو داعی و میزبانِ عالم

ہم قلیۂ چرب و لقمۂ گوشت
تو قوّت و عظمتِ مجسّم!
تاریخ کی اِبتدا سے اب تک
جاری ہے یہ مشقِ جَور پیہم
انسان کے ہاتھ میں چھری ہے
بکروں پہ ہے جانکنی کا عالم
قصّاب شقی ہے آگے آگے
دنبال میں گلّہ بانِ اظلم!
جَلّاد ہیں صف بہ صف جلو میں
پا بستہ ہیں اک قطار میں ہم
"میں میں" کی پُکار اس طرف ہے
اُس سمت ہے ہمہمہ کہ "ہم ہم"
ہم ہیں کہ ہماری زندگی میں
پیدا ہوئے حلق و تیغ باہم
اور تو کہ اجل ہے تجھ سے عاجز
اللہ رے تیرا عزمِ محکم

مخلوق میں یہ تضاد کیسا؟
اے اشرفِ خلق ابنِ آدم
کنجشک عقاب؟ گاؤ، قصّاب
دامانِ غزال و دستِ ضیغم
صیّاد ہیں ہر جگہ میسّر!
اور صید ہیں ہر طرف فراہم
خلقت کے خلاف کس نے کی ہے
اللہ! یہ سازش منظّم؟
حیواں ہی نہیں قتیلِ انساں
آدم بھی ہے خود شہیدِ آدم
دونوں طرف ایک سا ہے دستور
دونوں طرف ایک سا ہے عالم
افسانۂ گوسفند بھی ہے!
اِک پرتوِ سرگزشتِ آدم

# گوشۂ فارسی

# گوشۂ فارسی

اپنے فارسی کلام کے بارے میں بجا طور پر مرزا غالب کا دعویٰ تھا کہ فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ ! مگر میں اپنے اردو کلام کے بارے میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است ۔ کلیات کی مناسبت سے منتخب فارسی کلام حاضر ہے ۔ مگر چالیس سال سے فارسی میں نوائے سروش اور الہام غیب کا سلسلہ منقطع ہوگیا ہے ۔

افسانۂ ما بیش ازیں نیست کہ گفتیم
گشتیم و گذشتیم و پدیدیم و نہفتیم
دیدیم کہ منکر ز عزیزاں نتواں شد
یاراں ہمہ مے خوردہ بخفتند بخفتیم

# فروغِ مہر

ازفروغِ مہر سیمائے اُفق تابندہ شد
شب بسرآمد کہ ایوانِ سحر رخشندہ شد
ملّتِ ما از فسونِ سامری خوابیدہ بود
نغمۂ روح الامین بشنید و روحش زندہ شد
مطربِ ما از تفنن نغمہ ہائے نوسرود
ساقیٔ ما از تلطف بزم آرایندہ شد
غنچۂ نو خیز از خوابِ خزاں بکشود چشم
مُرغکِ پرسوختہ برشاخِ گل رقصندہ شد

○

آفتابِ تازہ از بطن افق آمد پدید
بزمِ مشرق از جمالش مطلعِ انوار شد
خواب آزادی ہم از تعبیرِ نوشد بہرہ یاب
روحِ آزادی ہم از خواب گراں بیدار شد
مژدۂ عہدِ بہاراں در چمن آمد پدید
انقلابِ نو بہ اقوامِ کہن آمد پدید

# نوگرفتار

مشنو قصه ام که ناشادم
نو گرفتار و تازه دامادم
آدمم از بهشت محرومم
از شرف بر حضیض افتادم
حجله آرا و قیدیٔ بختم
نغمه افشاں و پُر ز فریادم
خضرِ راهِ شوق دستم گیر
که به صحرا زپا در افتادم
بس نشیب و فرازها دیدم
چوں عنانم بدست دل دادم
چشم پُر آب و دل همه آتش
کشتهٔ رستخیزِ اضدادم

○

بربطم از عالم بالا سروش آورده است
زیں سروش ارباب محفل را بجوش آورده است
طائرانِ صبح را آورده ام اندر نوا
مرغکِ تصویرِ مارا در خروش آورده است

# مورِ دانه کش

هاں ! نمی بینی به مورِ دانه کش
کز پئے روزی چه رنجے می برد
خیز و برخیز و میارام و مرم
آں که رَنجے برد گنجے می برد

○

آزمودی هم تنگ و تازِ مگس
ریزه ها از سفره ها دست آورد
دل نه بردارد زسعی و جستجو
گه زبالا گاه از پست آورد

○

دیده ای آشفتگیِ پشه ای
دست و پا بهر خورش چوں می زند
اندلِ بیدار و همت جوئے خود
بر سرِ خوابیده شب خوں می زند

○

اے برادر ! درمصافِ زندگی
سر بباز و جاں بباز و دل بباز
گاه رزقِ بیش از قسمت مجو
گاه بر سرمایۂ حاصل مناز

جستجو، سوزِ زیست ما، سوزِ جستجو
شعلۂ زندہ بہ بخشد مردہ را
آرزو، برقیست برقِ آرزو!
مہر سازد ذرّہ افسردہ را!
نکتۂ ای از پندِ دانا یاد دار
قیمتش از گنج قاروں برتر است
کافری بے مایگی بے حاصلیست
آں کہ می جوید بگو پیغمبر است

○

فلک از روز و شب بر حُسنِ مہر و ماہ می نازد
زمیں ہم بر تجلّی ہائے حق آگاہ می نازد
عجم ایوانِ کسریٰ را متاعِ فخر می داند
عرب بر عظمتِ بیت خلیل اللہ می نازد
رئیسؔ امروہوی نازم بخاکِ پاکِ امروہہ
کہ ایں بر روضۂ حضرت ولایت[1] شاہ می نازد

○

---

[1] جدّنا و سیدنا حضرت سید حسینؒ شرف الدین شاہ ولایت امروہہ (ہند)

# منم آں

منم آں کہ از خاکِ پاکِ حجازم
چرا بر غلوے نژادے نہ نازم
ز فردوس و کوثر بسے پاک اصلم
ز خورشید و انجم بسے سرفرازم

○

دوش کز فرطِ تعب در دل من تاب نہ بُد
دوستاں بر سر بالیں بہ نشستہ بے خود
سازہا گم ہمہ آمادہ ولے خیر گذشت
ملک الموت فرو مایہ مرا خواند و بخند

○

مقامِ شکوہ نہ جائے فغان و فریاد است
کہ ارض شرق چو دوزخ مصیبت آباد است
فرشتہ ای کہ وکیل است بر خزائنِ رزق
حقوق خویش بدست فرنگیاں داد است

خضرِ دل افسردہ من آوارہ منزل ناپدید
المدد اے جذبِ کامل تا بمنزل وا رسیم
آدمے آورد ما را برزمیں از اَوجِ خلد
آدمے دیگر بباید تا بدانجا وا رسیم

○

از پےِ جاناں متاع سوزِ جاں آوردہ ام
از دو چشم جلوہ پرور دو جہاں آوردہ ام
دستہ ہائے گل ~~بہ چیدم~~ از دل پُر داغِ خویش
زخم ہائے دل برنگِ گلستاں آوردہ ام
کارواں در کارواں گردیدہ ام از بہرِ دوست
شوقِ منزل کارواں در کارواں آوردہ ام
پَر شکستہ طائرِ ہمت پرِ پرواز یافت
آدمی فردوس راگم کردہ بود و باز یافت[1]

○

جہاں کہ رُو بہ خرابیست ازجہانِ من است
خراب باد زمانے کہ در زمانِ من است

---

[1] بہ موقع ورود پاکستان (۱۹؍اکتوبر ۱۹۴۷) گفتہ شد

# بہ ذوقِ نیاز

صبا ! بخدمت پیرِ طریقِ مسلکِ ما
بِبَر او بہ ذوقِ نیاز و بہ ذوقِ اہلِ نیاز
بگو کہ اے گہر افروز خانوادۂ حق
بگو کہ اے ہنر آموزِ طالبانِ مجاز
بگو کہ اے بہ قدم سالکِ مسالکِ شوق
بگو کہ اے بہ قلم شارحِ حکایتِ راز
گماں برم کہ بہ اوجِ کمال تو نہ رسد
ہزار پایۂ لوح و قلم بوَد ممتاز
یقیں کنم کہ بہ حُسنِ مقالِ تو نہ شود
سخن سرائے صفاہان و بلبلِ شیراز
ہم از زیارتِ درگاہ تو نصیبم شد
سعادتے کہ میسر نہ گشت وقتِ نماز
ہم از لطافتِ گفتار تو فراہم شد
حلاوتے کہ بہ کامم نہ شد ز نغمۂ ناز
بہ محفلے کہ دَم از علم و معرفت بزنی
بہ اوجِ ناز حقیقت پسند اہلِ نیاز

به مجلسے که سخن از یقین و حق رانی
نقاب وہم و گماں برفتد ز چہرہٗ راز
صحیفۂ سخن آراستی به این تزئیں
که شد صحافتِ اردو زِ کلکِ تو ممتاز
خبر نویس مقاماتِ ذوق و وِجدانی
بر آں که اہل خبر شد خبر نیاید باز
خوشا زماں که به بزم لطیف و اشرف تو
به حرفِ ناز تو بودی و من به عرض نیاز
خوشا زماں که به تعلیم گاہ دانش و علم
ہزار نکته بگفتی تو از لب اعجاز
بیا بیا که زمانے گزشت در طلبت
زمانِ رفته گرفتم دگر نیاید باز
بیا بیا که دریں بزم جائے تو خالیست
رئیسِ انجمن دانشی و بزم طراز!

# خوشا بغداد

بہ گیتی انچہ از داد است و خوش باد
خوشا بغداد و خاکِ پاکِ بغداد
بلادِ شرق را زیبا عروسے
عروسِ دہر را زیبندہ داماد
ہوایش خرّم و آبش گوارا
سپہرش روشن و خاکش طرب زاد
بنائے نصرت و معمورۂ نصر
کہ منصور[1] ش ہمی کرداست آباد
خوشا ایں قبّۂ اسلام و جاہش
فسون با بلیاں رفت از یاد
ازیں خاک است آنچہ درجہانست
زعلم و آگہی و دانش و داد
ازیں شہر است انچہ در زمان است
رواجِ شرع و دین و دانش و داد
بخواں تاریخ بغداد ار نخوانی
بپرس از مردمانِ عاقل و راد

---

[1] منصور عباسی نے بغداد کو آباد کیا تھا۔

خوشا روزے وخرّم روزگارے
کہ بُود این قبّتہ الاسلام آباد
فقیہہ و قاضی و مفتی و مُلاّ
ادیب وشاعر و صوفی و استاد
زشرق و غرب عالم رُونہادند
دریں دارالامان و دارالارشاد
خوشا معمورۂ از ألفِ لیلہ
کہ از افسون و افسانہ شد آباد
جہانیست از جہانِ فضل و معنی
کہ از آشورو بابل می دہد یاد
چہ زیبا داستان ہا می سرودند
شب دجلہ و صبحِ نُورِ بغداد
بہ عہد دولتِ ہارُون و مامُون
بہ دھر آوازۂ اجلالش افتاد
لوائے عظمتِ عَبّاسیاں را
بہ افراشت از کمال دانش و داد
بحضرت گاہ تمکین و جلالش
دمشق و قاہرہ برپاے اِستاد

ولے چوں پنج صد سالہ اساسش
بہ ضربِ تیشۂ مغلاں در افتاد
نہ مستعصم اماں یابد نہ قومش
نہ دجلہ خوں بہا گیرد نہ بغداد
زوالِ عظمتِ اسلامیاں آہ
بر آورد از دلِ اسلام فریاد
خرابی ہائے بغداد و سوادش
ہمہ نظم جہاں را کرد برباد
ولے بر کندنِ بنیانِ کہنہ
عمارت ہائے تازہ راست بنیاد
مخور رنج خرابی ہا کہ گردوں
خرابی درنہادِ خاک بنہاد
چو شد ہنگامۂ تاتار دیدیم !
ہلاکو خاں نماند و ماند بغداد
بحمد اللہ صبح نو پدید است
نمی ماند شبِ ظلم و نما ناد

# نذرِ رومیؒ

نغمہ ہائے جاں چکد از نائے اُو
جاں دمد در تن زیارب ہائے اُو
وحیِ منظومش صلائے عام بود
بر لبش نے مطربِ الہام بود
آں مسیحِ جاں کلیمِ اولیا
بر لبش نے بود و در دستش عصا
شرحِ رازِ خود بہ شرحِ رازِ نے
آں کہ خود می گفت در آوازِ نے
بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند
مرشدِ اقبالؔ مولانائے روم!
محرمِ اسرارِ عرفان و علوم
من نمی گویم کہ آں عالی جناب
ہست پیغمبر ولے دارد کتاب
مثنوی اش مصحفِ ایمانِ عشق
در زبانِ پہلوی قرآنِ عشق

# گفتم و گفت

چوں پریدم از مکان و لامکاں
پر کشودم در فضائے بے کراں
از حدوث و از قدم ہا بے نیاز
از ازل ہا و زابد ہا بے نشاں
چوں حجابِ کُن فکان برداشتم
دیدم اندر پردۂ بے کن فکاں
مجمعِ روح الامیناں صف بہ صف
سر بروں آورد پیکر زاں میاں
گفتم اے روح الامیں وحیِ اَم بدہ
گفت تو روح الامینی خود بخواں
گفت اے مُلہم زالہام بگو
گفت الہام است نطق جاں بجاں
گفتم اصل شاہد و مشہود چیست؟
گفت خود بیں شو بچشم امتحاں
گفتم اسرارِ شہود از من بگو
گفت مشہودے نیا بم درمیاں

گفتم این بود و نبود و ہست و نیست؟
گفت میزان وجودِ این و آں
گفتم از احوالِ کفر و دیں بگو
گفت ہر دو عالمِ روحانیاں
رستگاری نیست کس رازیں دو بخت
یا چنیں قسمت شود یاآں چناں
گفتم آخر این جہانِ راز چیست
گفت رازے از جہانِ جاوداں
گفتم از یزداں نشاں جستم بسے
گفت از آدم نمی یابم نشاں
بوالبشر را بو البشرہا بودہ اند
یک جہاں میرد کہ زاید صد جہاںؔ!
گفتم این آئینِ مرگ و زیست چیست؟
گفت تقدیریست پیدا و نہاں
گفتم اندر پردۂ اسرار کیست؟
گفت سرّے کو نہ گنجد در بیاں
گفتم از ترکیب جسم و جاں بگو
گفت روحے در تن و جسمے بجاں

گفتم آں تکوین و آں کُن از چہ بُد
گفت ایں را کس نمی داند بداں
گفتم آخر سرنوشتِ خلق چیست
گفت از خالق بہ پرسیدن تواں
چوں بہ خلقش آفریں گفتم بگفت
آفریں بر آفرینش ہا مخواں!
جوہر آیئنہ پنہاں شد زچشم
زنگ بر رُویش ہمی بینم عیاں!
آفرینش چیست؟ زنگ آئنہ
صورت زنگار را جوہر مخواں
چوں بہ پرسیدم ز طغیانِ حیات
گفت یک موجِ وجودِ بے کراں!
چوں بہ پرسیدم ز ہیجانِ شعور
گفت یک سیلِ حیاتِ بیکراں
چوں بہ پرسیدم ز روحِ کائنات
گفت اورا صد ظہور و صد نشاں
گفت آب و آتش و خاکست و باد
گاہ نورِ دانش و عرفانِ جاں

گاہ خیر و حکمت و اشراق و کشف
گاہ شر و جہل و عصیان و گمان
گاہ فیضان است و گاہے ابتلا
گاہ انعام است و گاہے امتحاں
چوں بہ پرسیدم کہ روحِ دہر چیست
گفت آزاد است از قید مکاں
دہر ہیجا نیست از غیب و شہود
ہر زماں پیدا و پنہاں ہر زماں
گفتم از عقل فسوں پیشہ چہ سود
گفت تا مصئون باشی از زیاں
گفتم از عشق گراں مایہ چہ ذوق؟
گفت تا محکم شوی در امتحاں
عُقدہ ہا از جان و دل نتواں کشود
جذبِ ہندی دانش یونانیاں
ہر دو جاں را دانش و دل را فروغ
عشق رنج آموز و عقل رائیگاں
عقل از عشق حقائق استوار
عشق از عقلِ حقائق کامراں

# تضمین

## بر کلام مرزا عبدالقادر بیدلؔ

بیا کہ صرصرِ صحرا بہار آمیز است
بیا کہ تودۂ خاکِ خزاں چمن خیز است
شکستِ توبہ زیادہ علاج پرہیز است
بیا کہ آتشِ کیفیّتِ ہوا تیز است
چمن ز رنگ گل و لالہ مستی آمیز است

قوی کہ جلوۂ گل ہا زتو کرشمہ طراز
قوی کہ باد سحر ہا زتو فسوں پرداز
قوی کہ سرو و سمن ہا زتست سرافراز
بہ گلشنے کہ نگاہت فشاند دامن ناز
چو لالہ دیدۂ نرگس ز سرمہ لبریز است

نسیم زلف تو عطرِ مشام دشت و چمن!
ہوائے وادی کنعان و بوے پیراہن
غبار کوچۂ تو رشک آہوانِ ختن!
نسیمِ زلف تو صبحے گذشت از گلشن
ہنوز سلسلۂ موج گل جنوں خیز است

اُمید ما ہمہ آتش مرادِ ما ہمہ باد
گہے چو بادِ رواں شد گہے چو شعلہ فتاد
زنا مرادیِ عہد کہن نباید یاد!
گدا ختیم نفس ہا بہ جستجوے مراد
ہوائے وادیِ امید آتش آمیز است
بدست از ورق گل رسالہ‌ای دارم!
دراں رسالہ زجاناں حوالہ‌ای دارم
بلب زقول و ترانہ مغانہ‌ای دارم
زفیض چاکِ دل اندازِ نالہ‌ای دارم
چو غنچہ تنگ مشو مرغ ما سحر خیز است

○

باز آں جلوۂ مستور نمایاں شدہ است
باز آں چہرۂ محجوب درخشاں شدہ است
باز سامان تماشا کدۂ جاں شدہ است
باز سرگرمیِ نظارہ بہ ساماں شدہ است
شعلۂ آتش دیدار گل افشاں شدہ است

دل کہ صد قلزم تسکین بہ تلاطم دارد
صورتِ قطرۂ وپہنائیٔ قلزم دارد
آب از گریہ و شعلہ ز تبسّم دارد
زیں چراغے کہ طرب جوشیِ انجم دارد
آفتابِ دگر از آب نمایاں شدہ است

آتشِ آں نیست کہ از سینۂ صہبائی نیست
باد بر باد کہ از گیسوے زیبائی نیست
خاک جز گردِ رہِ بادیہ پیمائی نیست
آب را ایں ہمہ کیفیّتِ رعنائی نیست
مگر از پرتوِ فیضِ قدمے جاں شدہ است

آشتی پیشہ نباشند سپیدی وسیاہ
نور و ظلمت ہمہ درجنگ وکشاکش، واللہ
صُلح کل را نہ بود در صَفِ حق جویاں راہ
صلح کل نذرِ حریفاں کہ دریں عشرت گاہ
آتش و آب ہمہ دست وگریباں شدہ است

آہ زاں شامے کہ وصلِ دلبرم آمد بیاد
آہ زاں صُبحے کہ مہرِ انورم آمد بیاد
اشک و آہِ عشق آشفتہ سرم آمد بیاد
شب کہ طوفاں جوشِ چشم ترم آمد بیاد
فکرِ دل کردم بلاے دیگرم آمد بیاد

یاد م آمد دلبرے لالہ قبلے شوخ و مست
جاں بدر رفت از تن کاہیدہ جان و دل بدست
طالبِ وصلش نباشد عاشقِ ہجراں پرست
تا سحر بے پردہ گردد شبنم از خود رفتہ است
الوداع اے ہم نشیناں دلبرم آمد بیاد

بسکہ احوالِ دلِ غم پرورم را آگہی!
غم گسارِ اہل دل اے خود فراموشی توئی
مدّعیِ دانشم از دعوی بے دانشی
اے فراموشی کجائی تا بہ فریا دم رسی
باز احوالِ دل غم پرورم آمد بیاد

می کشد رختِ ریائ انجمن در انجمن

ننگ سیمائے عبادت سجدۂ بے ذوق من

سجدہ بخشا ! شرمسارم از جبینِ خویشتن

با کدا ییں آبرو خاکِ ارم خواہی شدن

داغ شو اے جبہہ ! دامان ترم آمد بیاد

○

معراج محمدؐ کہ عروج بشری بود

در عالمِ فانی ابدی وازلی بود

معراجِ علیؑ در حرم کعبۂ یزداں

بر دوشِ نبیؐ دوشِ نبیؐ دوشِ نبیؐ بود

○

جمالِ مشرقین از ما فروغِ مغربین از ما

علیؑ را عین حق می گویم وایں عینِ عین از ما

رموزِ دینِ حق از ما بپرس آیا نمی دانی

نبیؐ از ما علیؑ از ما حسنؑ از ما حسینؑ از ما

# می خیزد

تو نویدِ سحر و بہرِ نو آورد رئیس
نغمہ ای کز نفسِ بادِ صبا می خیزد
تو فروغِ چمن و از پئے تو می چینیم
گلِ اخلاص کہ از شاخِ وفا می خیزد
بَرکشا پردۂ افکار کہ ایں پردۂ راز
پردہ ای نیست کہ از دستِ دعا می خیزد

○

سروِ آزادِ چمن آزاد باش
نوحۂ مرغِ اسیر از من مپرس
خسروِ ایوانِ خوبی شاد باش
روزگارِ ایں فقیر از من مپرس
رنجِ محروماں شنو از من مرنج
عذرِ معذوراں پذیر از من مپرس
تو ہمہ ناز آفرینی من نیاز
اے جواں! احوالِ پیر از من مپرس

# خواجۂ چشتی

خواجۂ چشتی ! فروغِ چشتِ ما
خوب می دانی زخوب وزشتِ ما
از سرِ اجمیر تا ملتان و سند
مرشدِ ہندی توئی سلطان ہند
ہند را نازِ جہاں بانی توئی
بندگی از ما و سلطانی توئی
تو کہ شمعِ خاندانِ چشت بود
خواجۂ از خواجگانِ چشت بود
زورِ کفرِ ہندیاں زیر از توشد
تو معین الدین واجمیر از توشد
ہند را درمانِ محرومی توئی
بایزید و شبلی و رومی توئی
چشتی و اجمیریِ عرفاں سرشت
از تو چشت اجمیر شد اجمیر چشت
سازِ عشق از سینۂ پرسوز تست
عقل شمعِ انجمن افروز تست

از تو شد ایں نکتۂ اسرار سَہل
عقلِ عرفاں پاک تر از عشقِ جہل
عشقِ جہل آزارِ عقل مردم است
عقلِ عرفاں در رہ مولا گم است
مرکزِ اسرارِ ایماں می شود
عقل آخر عشقِ عرفاں می شود

# عقلِ عرفاں

عقلِ عرفاں چیست ؟ عرفانِ حیات
عشقِ عرفاں چیست روحِ کائنات
روزِ عشق از روزگارے دیگر است
عشق را لیل و نہارے دیگر است
صبحِ عشق از شامِ او زیبا تر است
شامِ عشق از صبحِ او رعنا تر است
عشق را زیبد حیاتِ تازہ تر
میرد اندر شام و زاید از سحر
عشق محروم و نہ جوید مرحبا
عشق مقتول و نخواہد خونبہا

عقل ما از انقیاد و نقل نیست
عقل از عشق است و عشق از عقل نیست
عشق فارغ از فنا و از ممات
عشق حیّ و قادر و روح و حیات
جلوۂ ذات است و غیر اللہ نیست
عشق خلّاق است و خلق آگاہ نیست
جز شعورِ انفس و آفاق نیست
عشق بے حُسن است و بے عشاق نیست
عاشقاں را عقلِ عرفانی ز تو
عاقلاں را عشقِ ربّانی ز تو
عشق و عقل از یک نہاد و یک سرشت
السلام اے خواجۂ خدّامِ چشت

# ترک نامہ[1]

ساقیا! برخیز و پیمانہ بزن
برخرد شب خون ترکانہ بزن
در بہاراں ہجرِ نیکویاں بداست
مے بجامے گیر و جام مے بدست
صوفی اندر صومعہ تاکے بہ رقص
مے بہ رقص آرو بدورِ مے بہ رقص
ورنہ شاید قفل کردن در بکوب
قفلِ بابِ مے کدہ را سر بکوب
خیل ترکاں ترک تازانہ رسید
فوجِ رنداں تابہ مے خانہ رسید
واں کہ از دور آمدہ آں را بہ بیں
ترک تازی ہائے ترکاں را بہ بیں
ترک مستم ترکِ مے ناید بکار
مے ز تاکستانِ انگورہ بیار
ارمغانی بادۂ ناب عنب
جرعۂ از آب حیوانے طلب

---

[1] برمناسبت ورود وفد ترکیہ در پاکستان۔

آبِ حیواں خانہ زاد قونیا ست
قونیہ سرچشمہ جود و عطا ست

قونیہ آں شہرِ عرفان و علوم
آستانِ پاک مولانائے روم

مے حرام و داد محرومی بدہ
بادہ از خم خانۂ رومی بدہ

تا کجا ایں رنج محرومی کشم
تُرکِ مستم بادۂ رومی کشم

مے کہ لاثانی شد است از مثنوی
مثنویِ مولویِ معنوی !

مثنویِ اُفتد دفترِ ایمانِ عشق
در زبانِ پہلوی قرآن عشق

آں جلال الدین مولانائے روم
آں جمال چہرہ زیبائے روم

نغمہ ہائے جاں زنائے اُو چکید
نائے او یک نغمۂ نو آفرید

ازجمالش روئے عشق افروختہ
سینۂ تُرک از نوایش سوختہ
ترکِ جان و ترکِ سر سرمایہ اش
اے خوشا ترکاں بزیرِ سایہ اش
درمیانِ ما و ترکانِ قوی!
مولوی ماست ربطِ معنوی
تفرقہ مابین پاک و ترک نیست
مرکز افکار مایاں ہم یکیست
پرچم ما مُستَنیر از یک ہلال
اخترِ ما ضو پذیر[1] از یک ہلال
مِلّتِ ما یک دل و یک قول شد
از کراچی تا بہ استنبول شد

---

[1] ترکی اور پاکستان دونوں کے قومی پرچم ہلال بردار ہیں۔

# حکایت نے

بشنوم از نے حکایت ہاے تو
اے دل و جانم فدائے نامے تو
حرف شوقم از حکایت ہاے تست
نے نوازا ! زندگی از نالے تست
وارہانم از جہول واز ظلوم !
مرشدِ اقبال! مولانا ے روم
مایۂ صدپارے وہوے من فرست
نغمہ ای ازمن بہ سوے من فرست
جانم از سوزِ نوایت زندہ باد
سازِ جاں از نغمہ ہایت زندہ باد
مولویا — معنویا — رومیا
چوں سروش غیب درجانم بیا
مولوی ! راز خفی را باز گو !
مثنوی معنوی را باز گو !
باز گو تا دل شکایت می کند
" بشنواز نے چوں حکایت می کند "

السلام اے داعیِ پیغامِ عشق
السلام اے خواجۂ خدّامِ عشق
مصرع ات درمان صدِ سودا ے ما
"اے طبیبِ جملہ عِلّت ہاے ما"
گم رہانِ شوق را خضرِ جلیل
سوختہ جانانِ جاناں را دلیل
مثنوی شمعِ منازل از تو شد
یک کتابِ تازہ نازل از تو شد
من کہ بس سرگشتہ وبے چارہ ام
در ہواے شوق تو آوارہ ام
کرب ہا غم ہا تپش ہا سوز ہا !
مبتلا و مبتلا و مبتلا !
آرزو دارم کہ قربانت شوم
زندۂ جاوید فیضانت شوم
تو کہ در قلبی و در جانی مرا
مبتلاے خویش گردانی مرا

باشد آں روزے کہ از فیضانِ تو
لقمۂ تازہ خورم از خوانِ تو
آں کہ می بخشد فروغ افکار را
فاش بیند چشم آں انوار را!
شپرہ چشمم بہ عہدِ آفتاب
در حجابم در حجابم در حجاب
اے گُلِ معنیٰ خزانم تا کجا؟
شعلۂ ہجرانِ جانم تا کجا؟
تا کجا ایں کرب و سوز و رنج و درد
تا کجا ایں قلبِ گرم و آہ سرد
تا کجا ایں آرزوئے بے کراں؟
تا کجا ایں جستجوے بے نشاں
ایں سفر تا چند؟ بے زادِ سفر
ایں نظر تا چند؟ بے ذوقِ نظر
صد طلب دارم رہِ مطلوب کو؟
عشق می ورزم ولے محبوب کو؟

# ارمغانِ دوستی

اے گرامی قدر مہمانانِ ما
از شما صد منتّے برجانِ ما
مژدہ ہائے زندگی آوردہ اید
ارمغانِ دوستی آوردہ اید
با دلِ مشتاق و خرسند آمدید
از بخارا و سمرقند آمدید
آں دیارِ حکمت و شعر و سخن
ہم بخاری[1] ہم نظامی را وطن
برلب جیحوں بہ ایامِ قدیم
سالہا اسلافِ ما بودہ مقیم
ما ہمہ داریم یک اصلِ اصول
کرغز و تاجیک و تاتار و مغول
ہاں مگر چوں دل بہ ہمت ساختہ
بُعدِ ظاہر از میاں برداشتہ
ہیچ دُوری گرچہ دُوری خوب نیست
درمیانِ طالب و مطلوب نیست

---

[1] اسماعیل بخاری ۔ نظامی سمرقندی

# سفرنامه

مژده اے ذوق طلب ! رنج سفر در پیش است
یک بیاباں بگذشتیم و دگر در پیش است

دل آشفته به بینی که ترا دشتِ جنوں
ہم چو ماتم زدگاں خاک بسر در پیش است

باز اے ہمتِ وحشت مددے می خواہم !
که مرا مرحلۂ دردِ جگر در پیش است

ہمرہاں در صددِ زاد سفر اندو مرا !
ز اشک ریزئ مژه سلکِ گہر در پیش است

صدمۂ عالمِ ہجرت ز کجا می دانند
خواجگان را که ہمه کیسۂ زر در پیش است

دلم از خاک وطن ، ہیچ تسلی نه شود
منزل دیگر و سامان دگر در پیش است

ہاں ! عزیزانِ جگرخسته وداعم بکنید
که رہم دور و درازاست وسفر در پیش است

عجبے نیست اگر پائے نگه می لرزد !
ہر کجا می نگرم دیدۂ تر در پیش است

---

[1] به موقع ترک وطن گفته شد ـ

پا بہ گِل از اثرِ گریۂ یاراں گشتم
بگذر آہستہ کہ خوں تا بہ کمر در پیش است

ہم صفیراں بہ چمن باز رسیدند و مرا !
تاکنوں مرحلۂ جُنبشِ پَر در پیش است

ہر کجا جوشِ جنوں می کشدم ؛ می تازم
من ندانم چہ قضا و چہ قَدَر در پیش است

کس نداند کہ دریں دشت دلِ وحشیٔ ما
چہ قَدر راہ برید و چہ قدر در پیش است

نیروی ترکِ وطن نیست و لے مجبورم
کیں سفر از پئے تکمیل ہنر در پیش است

باز دریاے سعادت بکشودند ملک !
غم مخور اے دل ناداں کہ ظفر در پیش است

نخل بندِ چمنِ فیض بہ من می گوید !
بکشا دامنِ ہمت کہ ثمر در پیش است

خاکِ امروہہ ! بخود ناز کہ فرزند ترا !
شرفِ ہم سریِ شمس و قمر در پیش است

رہ گذارے کہ ازاں اہل ہنر می گذرند
للہ الحمد ھماں راہ گذر در پیش است

غم دنیا ست مربّی و تو گوئی که مرا!
دامن مادر و آغوشِ پدر در پیش است
طیِ ارض و سفرِ خاک بدیں ساں کردم
تا بدانی که مرا سیرِ قمر در پیش است
خنک اے دیدۂ تر! شاہدِ مقصود رسید
مژدہ اے ذوقِ نظر کحل بصر در پیش است
ہمچو موسی بہ شبِ تیرۂ غم می نازم!
عشق را جلوہ گہِ طور مگر در پیش است
باصرہ را خضرِ بختِ رسا می گوید!
انچہ می جوئی و خواہی بنگر در پیش است
حوریاں بر فلک از فرط طرب می رقصند
آدمے را بہ درِ خلد گزر در پیش است
می شنیدم کہ ارم نیست بجز ذوق نظر
لوحش اللہ کہ فردوسِ نظر در پیش است
بختم آورد بدرگاہ حبیب جانم!
نالۂ نیم شبی را چہ اثر در پیش است
نامِ او برلب خود آرم و دانم کہ مرا
جوئے قند و عسل و شہد و شکر در پیش است

# قصیدۂ نعت

ازفیضِ نگاہت دلِ ما یافت مقامے
سرمایۂ صد عمرِ فروشیم بجامے
وارفتہ بہ عشقیم رکوعے نہ سجودے
افتادہ بخاکیم قعودے نہ قیامے
از دیر و حرم بگذر و مردانہ سفر کُن
طے می شود ایں جادۂ مشکل بدو گامے
ازکفر و شریعت نہ بری ذوقِ حقیقت
دانی کہ سیہ مست کند بادۂ خامے
از دانۂ و تسبیح دل ما نمی بندد
با طائرِ سورہ چہ کند دانۂ و دامے
درمقتلِ شوقم نہ مسیحے نہ صلیبے
برقلۂ عشقم نہ کلیمے نہ کلامے
برسدرہ و طوبیٰ نہ پسندیم نشیمن
از حور و ملائک نپذیریم سلامے
ما بزمِ فروزیم بہر رفعت و پستی
بہر دَمِ صبحیم، و چراغِ سرِ شامے

ما علّت ارض و فلک و قطب زمانیم
از ہستیٔ ماہست بہ کونین نظامے
در اوجِ سما بال و پر شوق کشانیم
کو طائرِ سدرہ کہ بہ افتاد زبامے
با وصف کہ، ما محرمِ الہام و وحی ایم
از محفل جاناں نہ درودے نہ سلامے
با وصف کہ از رفعتِ تخئیل بہ عرشیم
بر خاکِ درش نیست قیامے و مقامے
تا بادۂ صافی چہ رسد در صف رنداں
دُرداکہ نہ جام است نہ دُرد تہِ جامے
برخیز و برافروز سیہ خانۂ جاں را
در ظلمتِ شب زیب دہد ماہِ تمامے
رضوانِ ارم در رہت آشفتہ فقیرے
جبریلِ امیں بر دَرت افتادہ غلامے
ارض است بکوہت اثرِ منّت غبارے
چرخ است بہ راہت شتر شست زمامے
گر اذن کنی قطب بہ جُنبد ز مکانے
گر حکم کنی ماہ نہ جنبد ز مقامے

از ہیبتِ تو نجم درافتند زِ مدارے
وز غمزۂ تو مہر بہ اِستد زمقامے
پیش اُو سبک آکہ جہاں منتظرِ تست
بردار پئے جلوۂ عامے دوسہ گامے
تو ختم رسولانی و تو نفسِ نخستین!
تو اولِ مخلوق و توئی ختم امامے
مغز یکہ زسودائے ولایت بگریزد
ہرگز نہ رسد بوے شفاعت بہ مشامے
شخصیکہ بہ خاکِ درِ تو جبہہ نہ ساید
از دورِ سپہرش نہ میسّر شدہ کامے
سیرابِ سحابِ کرمت مزرع جانہا
از رشحۂ فیضت تہی جام است کدامے؟
تا چند لبِ تشنۂ ما سیر نہ باشد
از کوثرِ الطاف و کرم جُرعہ وجامے
اربابِ وصالیم و گلہ سنجی ہجرے
مرغ ملکوتیم و ہوا داریِ جامے
ستّارِ عیوبی! چہ خجالت زگناہے
علامِ غیوبی! چہ ضرورت بہ پیامے

# یعنی چہ

مرا کہ ہست تقاضاے ۔بود یعنی چہ
دریں سَراب کدہ ۔ زیں نمود یعنی چہ
ہزار بار چو دل یافتیم وگُم کردیم
شنیدہ ام کہ دل ازما ربود یعنی چہ
بہ گارِ تخم و نظر بر رہ سحاب مَبند
بکارِ دوست بیاں چند وسود یعنی چہ؟
زبان و گوش زگفت وشنود اِستادند
زبان وگوش بہ گفت وشنود یعنی چہ
طلسم خانۂ سرِّ سخن کلید نداشت
رئیس باز درش راکشود یعنی چہ

○

گرد فرِ جمشید شد و شوکتِ کے رفت
حالا خبرے نیست کہ کے آمد و کے رفت
از مستیِ دوشنبہ دگر یاد ندارم
مے برسرے آمد وے درپےِ مے رفت

# وطنِ ما

دردا کہ ہمہ صرفِ خزاں شد چمنِ ما
حالا منم و نوحۂ سرو و سمنِ ما
خواہم کہ قضا چنگ زند چوں بہ تنِ ما
برباد شود مُشتِ غبار بدن ما
تا باد بُرد ہدیۂ ما دبرِ وطنِ ما

تا جادۂ غربت منِ بے مایہ گرفتم
صد وحشت و اندوہ بہ ہم سایہ گرفتم
ہنگرچہ قدرِ شوق گراں مایہ گرفتم
آں خلعتِ دیروز کہ از دایہ گرفتم
خواہم کہ ہم امروز بباشد کفنِ ما

دیں را نہ پذیرفتم و دنیا نہ پذیرد
آں بندۂ بے دام کہ خواجہ نہ پذیرد
کنعانِ عزیزاں بہ تمنا نہ پذیرد
آں یوسفِ بختم کہ زلیخا نہ پذیرد
یعقوب بیک جَو نہ خرد پیرہنِ ما

دردیکہ بہ من کاتبِ تقدیر نوشت است
آں در خورِ کعبہ نہ کلیسا نہ کنشت است
نے بہرِ لبِ جو و کنارِ سرکشت است
نے ارزش آں درد بہ بازارِ بہشت است
جز در وطنِ ز در وطنِ در وطنِ ما

از ازل دو قوتِ کامل بباید در ظہور
رزم گاہِ ہر دو قوت صحن امکاں آمدہ
نور و نار و موسی و فرعون و نمرود و خلیل
آں یکے از اہرِمن دیگر ز یزداں آمدہ
نور و ظلمت باہمہ دُوری بہم خواہند ماند
ایں دو قوت گرم پیکاراند و ہم خواہند ماند

# غریب الدیار نامہ

تو اے کہ در وطن و در قبیلۂ خویشی
ملالِ خاطرِ سرگشتگاں کجا دانی؟
بہ بزمِ ناز شراب وصال می نوشی
ز سرگرانیٔ ہجراں ہنوز نادانی
دَمِ فسردۂ دلِ خستگانِ ہجرت را
ز سرد مہریٔ خود موجۂ صبا دانی
فغانِ گرم فسردہ دلانِ فرقت را
ز گرم طبعیٔ خود لحنِ جانفزا دانی
ہنوز عمرِ عزیزت بخواب می گذرد
بجان تو کہ نہ از مرگ و از بقا دانی
حیات خضر بجوئی براہ خضر بُرو
کہ سرِّ زندگیٔ لازوال تا دانی
ز خویش بگذر و ہم خویش را تماشا کن
کہ سہل نیست خود آگاہی و خدا دانی
ز وصلِ شاہدِ مقصود بہرہ یاب کُند
غمِ فراقِ وطن را کہ جاں گزا دانی

بُروں خرام ز صحنِ چمن چو موجِ
که تا لطافتِ عرضِ کمال را دانی
چو سیلِ تند ز قیدِ مکان بیروں شو
که از کشاکشِ هنگامهٔ بقا دائی
چو ماهِ نو به سپهرِ حیات رُخ به نما
که از مدارجِ تکمیلِ ارتقا دانی
رُموزِ غنچه ز آزادگانِ دهر بپرس
تو مرغِ رشتهٔ بپائی زگُل کجا دانی
بیا بیا و مترس از شدائدِ منزل
که مردِ راهی و خود را شکسته پا دانی
بیا بیا که عروسِ ظفر کنیزکِ تُست
دریں مبارزه خود را زبوں چرا دانی
کجاست تابِ سخن چوں تو رازِ هستی را
به طبعِ حاضر و اندیشهٔ رسا دانی
هر آں نتیجهٔ کوشش که سرزند امروز
ز روے فهم بدانم کز ابتدا دانی
سرشته اند بدانش خمیرِ طینتِ تو
همه فنون هنر حسب مدعا دانی

دل جنوں زدہ ام را معاف کن بہ کرم
کہ لب کشود بہ آزادی و بہ نادانی
دریغ بے دلم و دل دہے نمی بینم
فلک شکست دلے را کہ دلربا دانی
ہزار گونہ جفا دیدہ ام ولے ایدوست!
مرا نہ بے خبر از لذت وفا دانی
دعاے ماست کہ عمرِ عزیزِ تو بجہاں
دراز باد کہ صاحب دلِ خدا دانی

عہدِ گل است و گل نمی چینم
دامِ غم است و بے پر و بالم
اوجِ بشر را از دست دادی
ہم چو مگس ہا دست بمالم

# اسرارِ شرحِ دلبری

ہاں ! بگو جانِ رئیس اسرارِ شرحِ دلبری
حیف گر خود را زنخلِ طور کم تر شمری
از انا الحق در رگ و در ریشۂ من صور دم
زانکہ از منصور در ابرازِ حق بالاتری!
سرمۂ زاغ البصر درکش کہ تا از چشمِ دل
ماسوا اللہ را سوائے ماسوا اللہ بنگری
چوں بہ بزمِ خار و گل جلوہ بہ افشاند بہار
کس نہ گوید درچمن من دیگرم تو دیگری
وسعت دریا ہمیں با موج و باگرداب نیست
قطرۂ بے مایہ ہم دارد سَر پہنا وری !
تاچہ اندازہ غرورِ عشق کارے می کند
قیس انا لیلیٰ ہمی گوید بہ آشفتہ سری
دوش از من پیرِ معنی گفت می دانی کہ تو
کاروانِ دانش و علم و عمل را رہبری
اے کلیم طورِ معنی لمحۂ افکار تو !
آب و تابِ لن ترانی بُرد در جلوہ گری

می تپد ہم در دلِ تو آیتِ سوز و گداز
می چکد ہم از لبِ تو حال و قالِ دلبری
ہم بہ نیروے عمل از ہر قفس بیگانہ ای
ہم بہ بازوے سخن اندر چمن ہامی پری
در صفاے صیقلِ آئینۂ طبعِ خلیل
و ز ادائے شیوہ رقصِ بتانِ را آذری
چیست در پیشِ طلوعِ نیّرِ افکارِ تو!
جلوۂ فکرِ کلیمؔ و حسنِ طبع انوری
شیوۂ گفتارِ تو آہنگِ سازِ موسوی
اُسوۂ کردارِ تو نیرنگِ سحرِ سامری
اِمراء القیسی بہ خیلِ نغمہ پردازانِ نجد
سعدیِ عصری بذیلِ خوش نوایانِ دری
دیر را از نورِ اخلاصش چراغاں کردہ ای
گر بہ مسجد شمعِ محراب و فروغِ منبری
تو بہ ایں علم و فضائل تو بہ ایں شعر و کمال
گہ بہ سیناؔ ہمسر و گہ از سنائیؔ ہمسری
زخمۂ وحدت چو بر قانونِ کثرت می زنی
نغمہ و تکبیر خیزد از نشیدِ کافری

وحیِ منظوم است آنچه سر زند از فکرِ تو
کم ترین وصفِ تو فضل و کمالِ شاعری
زین دو اوصافِ گرامی گر بخود نازی رواست
خیلِ خوبان را امامی عشق را پیغمبری
گفته خود را اگر الهام می خوانی رواست
می ندانی شاعری جزویست از پیغمبری
از پیِ ذوقِ نگاهِ سامریانِ سخن
صد طلسمِ شعر می بندی به فنِّ شاعری
باغبانِ روضهٔ اسرارِ عالم طبعِ تست
برگ و بارِ نخلِ طوبائی به وصفِ بے بری
جز ظهیر و عنصری هیچک نیاید در شمار
هم نوایانِ چمن زارِ خودش گر بشمری
جز حکیم غزنوی دیگر نیاید در نظر
گر غبارِ منزل خود را بدقّت بنگری
الحذر زین ترّهاتِ ناپسندیده رئیس
می نه زیبد در قلندر پیشگی خیره سری

# اے معنوی

رومی ما با دردِ تو سنجیدہ ام
وز چمنت خوشۂ گل چیدہ ام
جمع کن این فکرِ پراگندہ را
درس فدائی بدھی بندہ را
نالۂ من از شور انا پُر شدہ ست
گوشِ من از گفت تو پُر دُر شدہ ست
خاکِ مرا پایۂ دیگر دہی
دل ز بَرَم بردی و دلبر دہی
رومیِ ما روحِ روانم توئی
بادشۂ کشورِ جانم توئی
جانِ فرو رفتۂ در گِل مرا
نور عطا کردی و حسن و ضیا
من کہ ہمہ ریب و شک آلودہ ام
بے بصر از نورِ یقیں بودہ ام
پس بہ ہمہ وحشت و آوارگی
رو بہ تو آوردہ ام اے معنوی!

# به برادرانِ ایران

ما به گردابیم یاراں دُور از جانِ شما
وندریں گرداب دستِ ما و دامانِ شما
اے جوانمردانِ ایراں بوئے ہمت بشنویم
بادِ فیروزی وزد چوں از گلستانِ شما
وحدتِ افکارِ ما یک عصرِ تازہ آفرید
از دیارِ پاکِ ما تا حدِ ایرانِ شما
باز با پیشاور و لاہور ہمدستاں شدند
مشہد و تبریز و تہران و صفاہانِ شما
ایں ہمہ فرہنگِ ما و شعر جز ایں بیش نیست
مصرعِ برجستہ از ابیاتِ دیوانِ شما
ما ہمہ یک دودمان و یک دل و یک ملّتیم
مُلکِ ما مُلکِ شما جانِ من و جانِ شما

بیا ساقی ، بفرما برقِ مے را
کہ سوزد خرمنِ فرداودے را
نو اے کہ ممتنع دانی تسلسل
چہ می گوئی شراب پے بہ پے را
غمِ عشقت تعالیٰ اللہ ایدوست
بدیں لذت نہ دیدم ہیچ شے را
ز فریادِ شب و روزم چہ نسبت
خروشِ بربط و طنبور و نے را
بیک جرعہ جہانم داد ساقی
چہ یارا ے کرم دہقانِ طے را
گدائے کوچۂ پیر مغانم
زنہشت پا زنم، جمشید وکے را
دمے با ساقی و مطرب بسر کن
کہ فردا را بقا باشد نہ دے را
زِ جنت نامراداں راچہ کاراست
کجا جوئی رئیسِ نیک پے را

در رہِ شوق گراں مایہ و بس نادارم
زادِ رہ از گہرِ آبلۂ پا دارم
ردِّ دعوت ز طریقِ سُفہا می باشد
غمِ آفاق کہ تلخ است گوارا دارم
زندہ کردم زدَمِ خویش گنوٗ سالہ دل(۱)
سامری کیشم و اعجازِ مسیحا دارم
للہ الحمد کہ با اہلِ جنوں کارم نیست
رہ روی بر اثرِ ناقۂ لیلےٰ دارم
از سیہ بختیِ یارانِ سفر باکم نیست
وارثِ حسنِ کلیمم یدِ بیضا دارم
عقل آوارگی آموخت ازیں آزادی
مرغِ دل راز جنوں سلسلہ برپا دارم
ہمہ معمورۂ آفاق پُر از خونِ وفاست
وائے برمن کہ دل و دیدۂ بینا دارم
زیں ہمہ مجد و شرف ہیچ از نیست و نبود(۲)
طلعتِ یوسف و تقدیرِ زلیخا دارم

۱) گنوٗ سالہ ؟ جون ایلیا (۲) "نیست و نبود" محلِ نظر ہے اس کے بجائے نیست کہ من ہو سکتا تھا مگر میں تحریف کی
سارت نہیں کر سکتا۔ جون ایلیا۔

مارا زچاکِ جیب و گریباں تواں شناخت
شورے کہ درسراست زساماں تواں شناخت

اے راہ ناشناس! پئےِ راہ برمگرد!
منزل زمشتِ ریگِ بیاباں تواں شناخت

معیارِ مردمی غمِ عشق است و بس کزیں
صدق از دروغ کفر ز ایماں تواں شناخت

دردے کہ پیرِ دیر و حرم بخششم نمود
کافر تواں کشد نہ مسلماں تواں شناخت[1]

عزّ و کمالِ جوہرِ قابل زِ ابتلا ست
آب گہر زِ ورطۂ طوفاں تواں شناخت

رازے کہ در ضمیرِ مشیّت گذر کند
آں را بیک اشارۂ جاناں تواں شناخت

باطل نہ گفتہ ای کہ زحالِ تو واقفم
آرے بیک نظر غمِ پنہاں تواں شناخت

زحمت چہ می بری غمِ لیلیٰ برائے قیس
بے چارہ را زگردِ بیاباں تواں شناخت

---

(۱) "تواں کشد" محلِ نظر ہے، مسودے کی عبارت غیر واضح ہے۔ جون ایلیا

انچه که گفت گفت و نه گفت انچه حالِ دوش
از شوخیِ نگاهِ پشیماں تواں شناخت
مرغِ پریده ہوش چه داند که در قفس
رفتارِ نبضِ گُل ز رگِ جاں تواں شناخت
تو خود چمن شناس نه ای ورنه از خزاں
آوازهٔ ورودِ بہاراں تواں شناخت
گاہے به طاقِ کعبه و گاہے به سنگِ دیر
آخر رئیسؔ را بچه عنواں تواں شناخت

چشمِ بد دور آں مرادِ دوستاں
بر مراد دوستاں آید ہمی !
تا نه ایام جوانی بر خوریم
یار با بخت جواں آید ہمی
چوں سخن از خیل خوباں می رود
ذکر خوبش درمیاں آید ہمی

گلہ از رقیب دارم نہ سپاس از یگانہ
کہ بہ خوب و زشت ہستی گذرم قلندرانہ
چو گذشت آب از سرچہ اُمید از سفینہ
چو شکست موج لنگر چہ نگاہ بر سرانہ
دلِ من بخلدِ کوثر نمی بندد اے برادر!
کہ ہما فرود ناید بہ ہوائے آب و دانہ
ز فسردگیِ گل ہا متراش شاخِ تر را
چہ عجب کہ باز خندد گُلکے ازاں میانہ
بہ خمارِ صُبح گاہم چہ دہی مےِ شبینہ
چو بروز خود سیاہم چہ خورم غمِ شبانہ
چہ عجب کہ ذوق یابد دلِ دردمندِ عشقے
بحدیث غیر گویم ہمہ سترِ دلبرانہ
دو سہ روز بیش یا کم بہ ارم نساخت آدم
زکجا قرار یابم بہ بہشتِ جاودانہ

در جہاں انچہ کہ می جویم و خواہم بکجا ست
وقت آنست کہ عزمِ سفرم راہ نما ست
دل بہ کندازہمہ یارانِ طریقت اے دل !
کہ مسافر بہ رہِ سخت سُبک بارہ بجا ست
بارشِ سنگِ حوادث زفلک می بارد !
فرصتِ خودنگری در رُخِ آئینہ کجا ست
چمنِ دہر بہر لحظہ دگرگوں باشد
باغباں صبح و مسا در ہوس نشو ونما ست
غنچہ بشگفت و ہم آوازِ شگفتِ غنچہا
از پئے قافلۂ نکہتِ گل بانگ درا ست
کس ندانست درین محفل اغیار رئیس
از کجا آمد و عزم سفر او بکجا است

لطفِ وصلِ صنم از لُطفِ خدا می خواہم
نہ شود انچہ بہ دعوی بہ دعا می خواہم
روے اُو از افقِ نورِ سحر می بینم
بوئے او از نفسِ باد صبا می خواہم
دِل بہ امیدِ رہائیٔ و من ایں وحشی را
یا بہ زنجیر زگیسوے دو تا می خواہم
انچہ از شوخیٔ آں عربدہ جُو نتواں خواست
درشبِ وصل زنمکین و حیا می خواہم
دوست ایں گونہ تمنا نمی خواہد از من
بازمی خواہم و غافل کہ چرا می خواہم
خوں بہاے گل غنچہ نتواں داد وگرفت
دیدہ و دل ہمہ خوں گشت و بہا می خواہم
جرعۂ زہر بہ عنوانِ دوا می نوشم
مژدۂ وصل زپیمان قضا می خواہم!
دجلۂ خونِ دو عالم بہ جلو می بینم!
دشنۂ تیر حوادث بہ قفا مے خواہم
پادشاہاں بہ تمناے گدایاں نہ روند
پادشاہے بہ تمناے گدا می خواہم

مے بہ کامِ ہوشمنداں مایۂ عرفاں شود
کرد گارِ تن شود پرور دگارِ جاں شود
قطرہ قطرہ می چکد از خم بجام و مے بجام
قطرہ ہارا جوش طوفاں می دہد طوفاں شود
چوں دَود درتن دواے چارہ سازاں می کند
چوں دو درجاں علاجِ مصلحت بیناں شود
مے بہ کامِ دلبراں ایفاے صد پیمانِ ناز
مے بجامِ عاشقاں تاراجِ صد پیماں شود

○

عشق عیبیست اگر جوہرِ عرفانِ تو نیست
آہ زاں کفر کہ من جملۂ ایمانِ تو نیست
یاد دارم کہ در آئینۂ جان و دل من
جلوۂ ای بود کہ در عارضِ تابانِ تو نیست

○

رنجورِ فرقتیم و بجز وصل چارہ نیست
جانا ! بہ وصل کوش کہ مہلت دوبارہ نیست

عین عرفانم خراب مستیٔ رندانہ ہم
رہ بہ کعبہ می رود زیں کوچۂ مے خانہ ہم
عیبِ ماکم کُن چو عہد از چشمِ ساقی بستہ ایم
پیشِ او تجدیدِ پیماں می کند پیمانہ ہم
غمزۂ حُسنت نہ تنہا محرماں را رہزن است
راہِ محروماں زند آں عشوۂ ترکانہ ہم
رسم و راہِ کعبہ از دیوانگانِ عشق پُرس
کیں براہ دیر ہمو داست ایں ویرانہ ہم
طائرِ اوجِ وفا گاہے شکارِ ما نہ شد
دام برچیدیم و افشاندیم زیرِ رش دانہ ہم
چشم بکشائیم بجلوہ گاہِ جاناں از چرا؟
صد تماشا در بغل دارد تماشا خانہ ہم
جانِ ما و جانِ جاناں چوں نہ سوزد ہمدگر
می نپد از یک تجلّی شمع ہم پروانہ ہم
بے زبانی نیست شرحِ بے زباناں اے رئیسؔ
ہم نوائے عشق باشد نعرۂ مستانہ ہم

واماندہ از گرانیِ بارِ سفر مشو
بالِ طلب کُشا و گرفتار پر مشو
نظّارہ می دمد بہ تماشا گہِ جمال
در جلوہ گاہِ دوست خجل از نظر مشو
اے شامِ ہجرِ دوست! کہ عمرت دراز باد
صبحے زخود تراش و رہینِ سحر مشو
ایں کفر بندگیست کہ آئینِ بندگی؟
بر سجدہ ہا مناز و بہر سنگِ در مشو
گفتم کہ چیست نسخۂ آسودہ خاطری؟
گُفتند دل شکستہ زبیم و خطر مشو
گفتم کہ چیست مصلحتِ پیرِ مے فروش؟
گُفتند مے بنوش و بپے جام زر مشو
گفتم رئیس ارزشِ اہلِ ہنر زچیست؟
گفتا کہ خود فروش بہ عرضِ ہنر مشو

نادارم و زیں جنسِ دل و جاں چہ فروشم
یارانِ تہی دست ! بجاناں چہ فروشم
جنسِ عملِ ما ہمہ کفر است و ہمہ فسق
اے عشق ! بہ ایں جرگۂ ایماں چہ فروشم
رفتم کہ بہ جانانہ فروشم دل و دیں را
گفتم کہ بہ آں مشتریِ جاں چہ فروشم
آنم کہ وصال ارچہ گراں نیست نخواہم
مہجورم و زیں دولتِ ہجراں چہ فروشم
من بے سر و سامانم و بازارِ محبّت
گرم است ولے بے سر و ساماں چہ فروشم
آساں نتواں داد کہ ایں مایۂ اخلاص
جنسیست گرانمایہ و ارزاں چہ فروشم
گفتند رئیس از دل و دیدہ چہ فروشی
گفتم زِدل و دیدۂ حیراں چہ فروشم

در راہِ طلب فرقِ شب و روز حرام است
مہرِ دمِ صبحے نہ چراغِ سرِ شام است
از جامِ جم و مجلسِ جمشید چہ پرسی
آں رند گدایم کہ ہمہ جم ہمہ جام است
دانی کہ نسیمِ سحر و نکہتِ گل چیست؟
بر ما زگل و غنچہ درود است و سلام است
از عقل میندیش کہ ایں طائرِ دانا
صد بار بروں جستہ و صد بار بدام است
مستِ نگہی؟ از نگہِ مست بیا نور
کیفے کہ حلال است و خمارے کہ حرام است
در انجمنِ خوش نگہاں از نگہِ شوق
دیدیم و ندیدیم نگاہے کہ پیام است
بر ما کرمِ بوسہ کہ ایں گونہ کرامت
جانا! نہ شنیدی کہ زعاداتِ کرام است
از قیدِ رہ و رسم رئیس از چہ گریزی
آزاد کہ آزادہ ترے گشت غلام است

# کربلا

شمر با تیغِ برہنہ در قفا
کربلا در پیش مردانِ خدا
از شگافِ سر جبیں ہا لالہ گوں
تن ہمہ زخم و کفن ہا پُر زِ خوں
ابنِ ملجم دست بر تیغِ جفا
مرتضیٰؑ غلطاں بخوں اندر دُعا
عظمتِ حق را ہزاراں زیب و زین
زہر در کامِ حسنؑ قبل از حسینؑ
یک تنِ بے سر بدشتِ کربلا
یک سرِ بے تن بہ طشتِ اشقیا
ذبحِ اسماعیل را بخشد کریم
تا بگیرد فدیۂ ذبحِ عظیم
بُو البشر را از ارم بیروں کُند
تا سَرِ ہابیل را پُر خوں کند
سالہا نازِ ذکریاؔ می کشد
ارّۂ ای بر فرقِ یحییٰ می کشد

کور سازد دیدۂ یعقوبؑ را
داغ بخشد سینۂ ایوبؑ را
آں کہ زندان و زلیخا آفرید
یوسفے خواہد دریں قیدِ شدید
چوں نہالِ لطفِ او بار آورد
صد مسیحِ تازہ بردار آورد
از لبِ منصور می راند سخن
قاتلِ منصور را گوید بزن
ابتلا رمزیست از اسرارِ او
کربلا نقشیست از آثارِ او
صد ہزاراں کربلا در راہِ او
مشہدِ مرداں شہادت گاہِ او
مقتلے آراست باصد زیب و زین
از لبِ سقراط تا حلقِ حسینؑ
از پئے طفلِ صغیر و نیم جاں
در کمیں خولی ء ناوک در کماں

مرگ ہا آساں ازیں عزم وثبات!
تشنہ کاماں را لبِ آبِ فرات
شکرِ او افسانۂ کرب و بلاست
حمدِ اُو لب ہائے خونیں را رواست
جلوۂ حق چہرہ افروخت از حسینؓ
حمد او می باید آموخت از حسینؓ
حق کہ باشد اتباعش فرضِ عین
از حسینؓ است از حسینؓ است از حسینؓ
معجزِ انفاسِ شبّیرِ شہید
چوں نسیم اندر مشامِ جاں دمید
وہ چہ خوش ذکریست ذکرِ کربلا
فکرہا در ذکر و فکرِ کربلا
مشہد اُو مرکز و ملجائے ما
از حیاتِ عشق او احیائے ما
از حجابِ نورِ حق آمد برونؓ
باز شُد، انّا الیہ راجعون

وہ چہ خوش یادیست یادِ سرورے
عالمیاں پرورے عالم گرے
حق محقق گشت از تحقیقِ او
کربلا من جملہ تخلیقِ او
قوتِ تخلیق او عصر آفریں
روحِ ما بالغ تر از روح الامیں
حادثاتِ کربلا دانی زچیست
ایں ہمہ طغیانِ روحانی زچیست؟
در رہِ تسلیم سر انداختن!
پیشِ حکمِ حق سپر انداختن
آنچہ از عشق و وفا آموختیم!
از حسینؑ کربلا آموختیم!
عظمتِ حق از حسینؑ کربلاست
کارواں سالارِ مردان خدا است

# یا حبیبؐ

خواجۂ دنیا و دینی یا حبیبؐ
ہادیِ شرعِ متینی یا حبیبؐ
عینِ عرفان ویقینی یا حبیبؐ
در حریمِ جاں مکینی یا حبیبؐ

خاتمُ للمرسلینی یا حبیبؐ
رحمۃٌ للعالمینی یا حبیبؐ

عرشِ اعظم آستانِ جاہِ تو
منزلِ شرع وطریقت راہِ تو
بندگاں را قبلہ بیت اللہِ تو
کعبۂ روح الامیں درگاہِ تو

کعبۂ روح الامینی یا حبیبؐ
رحمۃٌ للعالمینی یا حبیبؐ

تا ترا مسند نشینت کردہ اند
دوجہاں را از توزینت کردہ اند
خواجۂ دنیا و دینت کردہ اند
شاہدِ جاں آفرینت کردہ اند

شاہد جاں آفرینی یا حبیبؐ
رحمتہ للعالمینی یا حبیبؐ

اے محمدؐ نام ومحبوبی نشاں!
جانی د جانانی و جانان و جاں
مصطفیٰؐ و مجتبائے دوجہاں
آیتِ حق برفرازِ آسماں

رحمت حق بر زمینی یا حبیبؐ
رحمتہ للعالمینی یا حبیبؐ

○

مرا کہ بال و پر جبرئیل بخشیدی
چرا نہ سدرہ و طوبیٰ نشیمنم کردی
ازیں فروغ ندانم کجا شوم فارغ
چو شعلہ گشتی وچوں شمع روشنم کردی
قبائے گردِ حوادث کہ جامۂ رنداست
برہنہ کردی وایں جامہ برتنم کردی




Phone : 70556

**Raisamrohvi Nagar Welfare Association (Regd.)**

129-A, Manikjee Street,
Garden East,
Karachi-3


Ref : ________ Date ________197

نگارِ صبح

نہیں کہ شکوۂ دردِ جگر نہیں ہے مجھے
مجالِ عرضِ تمنا مگر نہیں ہے مجھے

تغافلِ نگہِ دوست کی شکایت کیا
سبب یہ ہو کہ اپنی خبر نہیں ہے مجھے

دراز دستئ گلچیں و باغباں کی قسم
غرورِ دستگہِ بال و پر نہیں ہے مجھے

نگارِ صبح! ابھی خوابِ ہجر سے نہ جگا
کہ اعتبارِ نسیمِ سحر نہیں ہے مجھے

مرے اشعار ناقدری سے جن کی نکتہ چینوں میں
اتر جاتے ہیں نشتر بن کے اہلِ دل کے سینوں میں

چلے آؤ کہ تم پر اشکِ آخر بھی فدا کر دوں
جو قطرہ سا اک ہی لو رکی ہے آنکھوں کے خزینوں میں


ناشر

**ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ**

مین اردو بازار کراچی۔ فون: ۲۶۳۳۱۵۱